جنوری ۱۹۶۳ء

مدیر اعلیٰ: نیاز فتحپوری

نگار

پاکستان

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

سالانہ چندہ
دس روپے

مشکلات غالب

جس میں مولانا نیاز فتحپوری نے غالب کے اردو کلام کے ہر شعر کی نہایت مختصر 'جامع' واضح اور آسان تشریح کردی ہے۔ غالب کے سارے پیچیدہ اشعار کی باریکیوں اور نزاکتوں کو اس خوبی و سادگی سے اجاگر کیا گیا ہے کہ کلام غالب کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔

یہ کتاب غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے عموماً اور طلباء کیلئے خصوصاً نہایت مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

قیمت : دو روپیہ

عرض نغمہ

ٹیگور مشرق کے ان بلند مرتبہ شاعروں میں ہے جس کے روح پرور نغموں نے مشرق و مغرب دونوں کو یکساں متاثر کیا ہے۔ علامہ نیاز فتحپوری نے اس عظیم فنکار کے مجموعہ نظم ''گیت انجلی'' کو ''عرض نغمہ'' کے نام سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ترجمہ ٹیگور کی روح شاعری سے اس درجہ ہم آہنگ ہے کہ اس میں وہی سادگی پرکاری اور روح خیزی و دلکشی نظر آتی ہے جو ٹیگور کی شاعری میں ملتی ہے۔ جو لوگ ٹیگور کی فنی دسترس' شاعرانہ فطانت اور حیات پرور نغمات کی سحر آفرینیوں سے لطف اندوز ہونے کے آرزو مند ہیں ان کیلئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے اس لئے کہ ٹیگور کی شخصیت و فن سے بہرہ مند ہونے کیلئے اردو میں اس سے بہتر کوئی ترجمہ موجود نہیں ہے۔

قیمت : ایک روپیہ پچیس پیسے

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۴۷۲

جنوری سنہ ۱۹۶۳ء

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ
نیاز فتحپوری

نائب مدیران
فرمان فتحپوری
عارف نیازی

منیجر
قمر نیازی

زر سالانہ
دس روپے

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی زیر بموجب سرکلر نمبر ڈی/ ایف - یو پی - بی/ ۳۶۶۹ - ۷۶۸/ ۶۲ محکمہ تعلیم کراچی
عارف نیازی پرنٹر و پبلشر نے مشہور آفسٹ پریس سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ کراچی سے شائع کیا۔

"نگار پاکستان" کا سالنامہ ۶۳ء "نیاز نمبر" ہوگا

جس میں حضرت نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو مثلاً ان کی، افسانہ نگاری، تنقید، اسلوب نگارش، انشاپردازی، مکتوب نگاری، ذہنی رجحانات، صحافتی زندگی، شاعری، اداراتی زندگی، ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا جائیگا۔ گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت و فن کا ایک ایسا مرقع ہوگا جو اس سلسلے میں ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھے گا اور علم و ادب کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

متوقع مقالہ نگار

مجنوں گورکھپوری	فراق گورکھپوری	جوش ملیح آبادی	آل احمد سرور
رشید احمد صدیقی	ڈاکٹر محمد حسن	احتشام حسین	اثر لکھنوی
ابوالخیر مودودی	عبدالقادر سروری	نصیر الدین ہاشمی	ڈاکٹر اعجاز حسین
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	ڈاکٹر عندلیب شادانی	ڈاکٹر احسن فاروقی	ڈاکٹر شوکت سبزواری
ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں	ڈاکٹر سید عبداللہ	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	ڈاکٹر عبید عبداللہ
محمد طاہر فاروقی	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
رئیس امروہوی	مولانا حامد حسن قادری	کوثر چاندپوری	امتیاز علی تاج
عابد علی عابد	مولانا ارشد تھانوی	سید محمد تقی	شورش کاشمیری
محمد طفیل	مولانا امتیاز علی عرشی	پروفیسر شور علیگ	ڈاکٹر وزیر آغا
پروفیسر ارغد کاکوی	مولانا غلام رسول مہر	عشرت رحمانی	شان الحق حقی
برہم ناتھ دت ناصر	خواجہ تہور حسین	جمیل مظہری	راز مراد آبادی
نظیر صدیقی	پروفیسر حمید احمد خاں	پروفیسر خان رشید	ضیاء عباس ہاشمی
حنیف فوق	احسان دانش	ڈاکٹر صفدر حسین	رشید حسن خاں
ممتاز حسین	عزیز حامد مدنی	سلیم احمد	نثار احمد فاروقی
پروفیسر سجاد باقر رضوی	سید ابوالخیر کشفی	ڈاکٹر اسلم فرخی	مجتبیٰ حسین
ڈاکٹر سید شاہ علی	ڈاکٹر عبدالقیوم	جمیل جالبی	ڈاکٹر سلیم حامد
ل احمد	یونس احمر	شمیم رضوی	شاہد عشقی
ممتاز مرزا	حسنین کاظمی	یوسف سرمست	انجم اعظمی
فضل حق قریشی	بہار کوٹی	مولانا عرشی	محمد زکریا مائل
محمد مرتضیٰ	محمد خورشید عالم	شاعر لکھنوی	ساقی جاوید
مرتضیٰ شفیع	امراؤ طارق	جمیل اختر خاں	عبدالسلام

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگیا

فہرست

ملاحظات	نیاز فتحپوری	۴
حافظ کے بعض واقعاتی، تلمیحی، وتفاولی اشعار	نیاز فتحپوری	۹
اردو میں ترجموں کی نوعیت واہمیت	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۱۷
غالب پر فارسی شعرا کا اثر	نریش کمار شاد	۲۵
مسئلہ ارتقاء	عصمت اللہ جاوید	۲۹
اردو غزل	یوگیندر پال صابر	۳۴
شاہ ظفر نہیں مضطر خیر آبادی	یونس حسنی	۳۸
عہد عباسیہ کا ایک ظریف درباری شاعر (ابودلامہ)	نیاز فتحپوری	۴۱
باب المراسلہ والمناظرہ (جوش وہوش)	نیاز فتحپوری	۴۴
باب الاستفسار: صابئین کون تھے؛ یہ منہ اور مسور کی دال؛ امام ابوحنیفہ کا اصل خاندان	نیاز فتحپوری	۴۶
رباعیات	جوش ملیح آبادی	۵۰
منظومات	فضا ابن فیضی، دانش فرازی، فضا جالندھری، تابش شجاع آبادی، اکرم دہلوی، شارق ایم-اے، حرمت الاکرام، سعادت نظیر، نشاط لکھنوی	۵۱
مطبوعات موصولہ	ادارہ	۵۶
زندگی اور ادب شاہان اودھ کے عہد میں (مسلسل)	ڈاکٹر سید صفدر حسین	۲۵

(ہندوستانی خریداران نگار کیلئے)

یہ سوال بڑا اہم ہے کہ نگار کا چندہ کس طرح روانہ کریں۔ ہم اس کا انتظام کر رہے ہیں لیکن جب تک اس کی تکمیل نہ ہو اپنا چندہ ذریعہ بنک یا بہ وساطت پاکستانی عزیز یا دوست کے بھیج سکتے ہیں۔

قارئین نگار سے ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے کہ "نیاز نمبر" فروری سنہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہو لیکن بعض اہم مقالات کے انتظار اور کتابت کی ناگزیر تاخیر کے سبب ممکن ہے کہ یہ خاص نمبر فروری سنہ ۶۳ء کے بجائے مارچ ۶۳ء میں شائع ہو۔ اس صورت میں فروری سنہ ۶۳ء کا پرچہ عام شمارہ ہوگا۔

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ:۔ **نیاز فتحپوری**

۴۲ واں سال	جنوری سنہ ۱۹۶۳ء	شمارہ ۱

نیاز فتحپوری

مُلاحظات

روس و امریکہ کا ذہنی اختلاف

اس وقت دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جس کی بیرونی سیاست خود اس کے اختیار میں ہو اور وہ اپنی مرضی سے کوئی خود مختارانہ فیصلہ اپنے حال و مستقبل کا کر سکے۔ کیونکہ نظام معاشرہ کی موجودہ غیر اخلاقی تشکیل نے سیاست عالم کو یکسر مادیت میں تبدیل کر دیا ہے اور اس نے بدقسمتی سے اتنی وسعت اختیار کرلی ہے کہ عہد حاضر کی کوئی حکومت ایسی نہیں جو صحیح معنی میں اپنے آپ کو آزاد اور "مستغنی عن الغیر" کہہ سکے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ باوجود اغراض کے امر وسیع اشتراک کے کلیدی فیصلہ کُن قوتیں صرف دو ہیں، روس و امریکہ اور اس وقت دنیا کا کوئی اقتصادی و سیاسی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کی تہہ میں ان کے اثرات کام نہ کر رہے ہوں اور چونکہ ان دونوں کے نقطہ ہائے نظر کا اختلاف روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اس لئے دنیا کا دور تذبذب بھی علی حالہ قایم ہے۔

پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے اس وقت تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جسے ہم صحیح معنی میں عالمی امن و سکون کا زمانہ کہہ سکیں۔ ہرچند اس سے انکار ممکن نہیں کہ دنیا کی متعدد حکومتیں جو غلامی کی زندگی بسر کر رہی تھیں اب آزاد ہو چکی ہیں، لیکن اس کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ حصول آزادی کے بعد بھی اپنے بقاء و تحفظ کے لیے روس یا امریکہ کی محتاج ہیں، تو یہ سب کچھ ہم کو کھیل ہی سا نظر آتا ہے۔

اس میں شک نہیں جس حد تک روس و امریکہ یا بالفاظ دیگر اشتراکیت و جمہوریت کی باہمی مسابقت کا تعلق ہے۔ روس ہمیں زیادہ کامیاب نظر آتا ہے خواہ اس کی یہ کامیابی کتنے ہی ناپسندیدہ اقدامات کا نتیجہ کیوں نہ ہو، لیکن یہ سمجھنا کہ اس کی یہ کامیابی کوئی ایسا مستقل نقش ہے جس میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں یا امریکہ کے بارے میں یہ یقین کر لینا کہ اس کی جمہوریت حال و مستقبل کا کوئی ایسا اٹل قانون ہے جس میں تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں، غالباً درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر آپ غور و تامل سے کام لیں گے تو معلوم ہوگا، کہ ایک طرف روس کی

اشتراکیت جو اسٹالن کے زمانہ میں شخصی [illegible] بہ صورت تھی اب آہستہ آہستہ ایک جماعتی قسم کی آمرانہ حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے اور مارکس و لینن کا تصور اشتراکیت تقریباً ختم ہو چکا [illegible] جو کا [illegible] امریکی جمہوریت کا ہے جس کا عالمگیر اقتصادی اقتدار دراصل ڈکٹیٹر شپ ہی کی دوسری صورت ہے جس کا تعلق حدود جغرافی سے ہو یا نہ ہو لیکن اقوام عالم کی ذہنیت پر اس شدت کے ساتھ مسلط ہے کہ وہ ممالک بھی جو اپنے آپ کو غیر جانبدار یا نیوٹرل کہتے ہیں، اس کے اثرات سے محفوظ نہیں، چنانچہ اب صورت حال کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ بین الاقوامی سیاست کو سمجھنے کے لئے ہم کو فرداً فرداً ہر ملک کے رجحانات معلوم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف روس و امریکہ کی نگاہوں کو دیکھتے رہنا کافی ہے (جنھوں نے سچ پوچھئے تو اس وقت چرخ نیلوفری کی گردش کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے)

مسٹر کنیڈی صدر امریکہ نے اپنے دو سالہ عہد صدارت کے اختتام پر جو تقریر حال ہی میں نشر کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ روس و امریکہ کے موجودہ تعلقات کیسے ہیں اور ان کے پیش نظر امن و سکون کی توقع رکھنا کتنی دور از کار بات ہے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ دنیا میں "بقائے باہمی" کا تصور اس وقت تک کامیاب ہو ہی نہیں سکتا جب تک روس اشاعت اشتراکیت کی کوشش کلیتاً ترک نہ کر دے اور یہ ممکن نہیں کیونکہ ترک اشتراکیت کا صرف ایک ہی مفہوم ہے کہ وہ جمہوری سطح پر آجائے اور اس سطح پر آنے کے بعد وہ کبھی امریکہ کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

مسٹر کنیڈی نے امریکہ اور روس کے موقف کا موازنہ کرتے ہوئے یہ بھی ظاہر کیا کہ جس حد تک جوہری اسلحہ کی تیاری کا تعلق ہے، دونوں ایک ہی قسم کی دو کشتیوں پر سوار ہیں اور دونوں اپنی اپنی حفاظت کے ذمہ دار۔ لیکن فرق یہ ہے کہ روس کی کشتی جس دھارے پر چل رہی ہے وہ ہماری راہ سے مختلف ہے۔ ہم تصادم سے بچنا چاہتے ہیں اور روس کو اس کی پروا نہیں۔ روس کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں آزادی قایم کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس کا مقصود اس سے صرف اشتراکی اقتدار کو وسیع کرنا ہے اور اس صورت میں ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم پوری قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں کیونکہ روس کی یہ پالیسی ہمارے مفاد کے بالکل خلاف ہے اور ہم کو حق پہونچتا ہے کہ ہم اسے کامیاب نہ ہونے دیں جیسا کہ کیوبا میں ہوا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مسٹر کنیڈی نے جو کچھ کہا ہے وہ بہت کچھ حقیقت پر مبنی ہے اور اب کہ روس و چین کے ذہنی اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں، "خروشچیف" کے لئے اس حقیقت کا تسلیم کرنا کچھ ناگزیر سا ہو گیا ہے، تاہم روس کی تاریخ اور روس کے ذہنی تشنج کو دیکھتے ہوئے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ "خروشچیف" کی آئندہ پالیسی کیا ہو گی اور اس کو قابل اعتماد سمجھنے کے لئے کتنا زمانہ درکار ہو گا۔

بھارت و چین

چین و بھارت کی سرحدی کشمکش جس نے محاربانہ رنگ اختیار کر لیا تھا، وہ تو اب باقی نہیں رہی، لیکن مصالحت کی صورت بھی اب تک پیدا نہیں ہوئی اور ممکن ہے یہ رنجش عرصہ تک قائم رہے یا قایم رکھی جائے، کیونکہ بھارت نے امریکن بلاک کے مختلف ممالک سے سامان حرب و اسلحۂ خودکار کی مدد حاصل کر کے اپنے آپ کو مختلف الجھنوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ پہلی الجھن یہ کہ وہ اس امداد کے جواز یا وجوب کی فضا کو کیونکر عرصہ تک قایم رکھے، دوسرے یہ کہ اس طلب امداد سے اس کی خودداری و غیر جانبداری کو جو اخلاقی صدمہ پہونچا ہے اس کی تلافی کس طرح کرے۔

بھارت کو ایک حد تک یقین ہو گیا ہے (خواہ وہ اس کا اعتراف نہ کرے) کہ بحالات موجودہ چین جنگ کے لئے آمادہ نہیں اور جنگ بندی میں اس کی تقدیم خلوص پر مبنی ہو یا نہ ہو لیکن اس کا ایک بڑا سبب یہ ضرور تھا کہ وہ بھارت سے تو بیشک لڑ سکتا تھا لیکن سارے یورپ و امریکہ سے مقابلہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ چین نے اس باب میں کافی دانشمندی سے کام لیا، اور بھارت کو الجھنوں میں ڈال دیا۔ کیونکہ امریکی بلاک کی پیش کش جو روپیہ اور زمانہ دونوں کی تعین سے بے نیاز ہے، بہ حالات موجودہ واقعی بڑی تسلی بخش چیز ہے، لیکن آئندہ بین الاقوامی سیاست اور بھارت کی موجودہ غیر جانبدارانہ پالیسی پر اس کا کیا اثر ہو گا۔ یہ شاید ایسی الجھن نہیں جسے آسانی سے دور کیا جا سکے۔

مسئلہ کشمیر

بھارت وچین کی آویزش کے سلسلہ میں، بعض ایسے سوالی مسائل بھی سامنے آگئے جنھیں کو تعطل میں ڈال دیا گیا تھا اور ان میں سے ایک مسئلہ کشمیر بھی ہے جس کے سبب ممکن بنا ہیں بعض عجیب و غریب خبریں سننے میں آئیں۔ مغرب کے بعض اخبارات نے یہ تجویز پیش کی کہ بھارت و پاکستان کو وفاقی حکومت میں ضم ہو جانا چاہیئے۔ بعض نے یہ کہا کہ کشمیر پر بھارت و پاکستان دونوں کا مشترکہ اقتدار مناسب ہے۔ خیر یہ باتیں تو صرف تفریحی حیثیت رکھتی ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ خود پنڈت نہرو کا بھی یہ ارشاد کہ اگر پاکستان "رائے شماری" کو ضروری چیز قرار دیتا ہے تو اس کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ سیاسی و اقتصادی اصول پر ہونا چاہیئے" اگر مذاق نہیں تو ایک معمہ ضرور ہے جسے شاید وہ خود بھی حل نہیں کر سکتے۔ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں اور بالکل درست سمجھتے ہیں کہ آزاد رائے شماری کا نتیجہ ان کے خلاف ہوگا تو پھر اس کی ضمانت کیا ہے کہ محض سیاسی و اقتصادی اصول کی صوابدید اہل کشمیر کے مذہبی جذبات پر غالب آجائے گی اور وہ غلط یا صحیح یہ نہ کہہ سکیں گے کہ پاکستان سے ہمارا الحاق سیاسی و اقتصادی اصول ہی کی بنیاد پر زیادہ مناسب ہے۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ مسئلہ کشمیر کا احیاء، خود بھارت کی سیاسی فکر کا نتیجہ ہے یا امریکن بلاک کی خواہش و اصرار کا۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ وہ پھر ایک بار سامنے آگیا ہے اور وزارتی سطح پر دونوں ملکوں کی گفتگو جو حال ہی میں ہوئی ہے۔ اسی سیاسی ہلچل کا نتیجہ ہے جو چین کے جارحانہ (یا بقول اس کے دافعانہ) اقدامات سے پیدا ہو گئی تھی۔

یہ گفتگو ۹ دسمبر ۱۹۶۲ء کو ختم ہو گئی اور دونوں ملکوں کے نمائندوں کی طرف سے جو بیان شائع ہوا ہے وہ ہر چند اسی سیاسی زبان سے تعلق رکھتا ہے جسے ہم صرف ابہام و ایہام کی زبان کہہ سکتے ہیں، تاہم جیسا کہ وہ کہتے ہیں اگر قابل اطمینان نہیں تو ناقابل اطمینان بھی نہیں ہے اور اب اس سلسلہ میں مزید گفتگو وسط جنوری میں ہوگی۔

کشمیر کا مسئلہ یوں تو بہ ظاہر بہت صاف ہے کیونکہ "رائے شماری" کے بنیادی اصول سے بھارت کو بھی اختلاف نہیں، لیکن اس میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے صرف رائے شماری کی تعبیر سے، یعنی بھارت یہ کہتا ہے کہ "رائے شماری" ہو چکی اور اسی کے نتیجہ کی بنیاد پر وہاں کا موجودہ نظام حکومت قائم ہے۔ پاکستان یہ کہتا ہے کہ بھارت جس چیز کو "رائے شماری" سے تعبیر کرتا ہے وہ "رائے شماری" نہیں بلکہ "رائے نویسی" ہے۔ "قلم در کف دشمن" کی اور اس لئے قابل لحاظ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کھٹک سے خود بھارت کا ضمیر بھی خالی نہیں اور اسی لئے وہاں کے بعض سنجیدہ اخبار بھی یہ سوال کر بیٹھتے ہیں کہ اگر یہ بات اپنی جگہ صحیح بھی ہو کہ کشمیر کا موجودہ موقف آزاد رائے شماری کا نتیجہ نہیں، تو اس کا تعلق صرف کشمیر کی آبادی سے ہے اور پاکستان کو احتجاج کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ بظاہر یہ بات بڑی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس باب میں بین الاقوامی انجمن کے اس فیصلہ کو سامنے رکھا جائے جس کی رو سے "رائے شماری" کی کارروائی بھارت و پاکستان دونوں کے اثر سے ہٹ کر عمل میں آنا چاہیئے تھی، تو اس مسئلہ کی صورت بالکل وہی قائم رہتی ہے جو تقسیم ہند کے وقت پائی جاتی تھی اور بھارت کے اخباروں کی یہ حجت کہ اس باب میں صرف اہل کشمیر کو بولنے کا حق حاصل ہے پاکستان کو نہیں، بہت کمزور ہو جاتی ہے۔

اس سے اصولاً بھارت کو بھی انکار نہیں کہ ایشیا کا امن و سکون بہت کچھ باہمی تعلقات کی خوشگواری پر منحصر ہے، لیکن اگر اس فضا کی خرابی کا ذمہ دار بھارت اپنے آپ کو قرار نہیں دیتا تو کم از کم اس کے خوشگوار بنانے کی ذمہ داری تو اسے اپنے سر لینا ہی چاہیئے اور اس کی صورت صرف یہی ہے کہ مسئلہ کشمیر کو خالص سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور جذبات کو اس میں شامل نہ کیا جائے۔

آئندہ ۱۶ جنوری کو یہ گفتگو پھر دہلی میں ہوگی اور اگر اس سے فیصلہ و مفاہمت کے کچھ ایسے بنیادی اصول طے پا گئے جن پر بھارت و پاکستان متفق ہو سکتے ہیں تو راستہ زیادہ صاف ہو جائے گا اور امید کی جاتی ہے کہ اس کے پیش نظر "نہرو و ایوب" کی گفتگو غالباً نتیجہ خیز ثابت ہوگی لیکن قبل اس کے کہ ان تمام مراحل سے گزرا جائے، شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ فضا کو مکدر نہ ہونے دیا جائے اور اراکین حکومت کی طرف سے ایسے بیانات نہ شائع کیے جائیں جن سے تلخی یا بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اصل چیز جو صحیح معنی میں دو فریق کے درمیان صلح و آشتی کی فضا پیدا کر سکتی ہے

وہ جذبۂ رواداری و اخلاق ہے اور اس کی بڑی ذمہ داری بھارت و پاکستان دونوں ملکوں کی صحافت پر عاید ہوتی ہے جس کو بد قسمتی سے اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ایٹمی تجربات

تخفیف اسلحہ کی جو کانفرنس جینوا میں ہو رہی تھی، وہ اس لحاظ سے تو ناکامیاب رہی کہ ہائیڈروجنی تجربات کو ختم کر دینے کے بارہ میں روس و مغربی ممالک کے درمیان کوئی سمجھوتا نہ ہو سکا، لیکن چونکہ اس کانفرنس کا سلسلہ پھر ۱۵ر جنوری سے شروع ہوگا اس لئے ہو سکتا ہے کہ کوئی صورت مفاہمت کی پیدا ہو جائے۔

اس وقت تک تقریباً سو مرتبہ اس کانفرنس کے اجلاس ہو چکے ہیں، لیکن اب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور اکثر حضرات کا خیال ہے کہ یہ کانفرنس بالکل بے معنی سی بات ہے اور تضیع اوقات کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہیں، لیکن کم از کم امریکہ ابھی تک مایوس نہیں ہوا اور اس کے مندوب آرتھر ڈین برابر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

اس کانفرنس میں ایک فریق مغربی ممالک و امریکہ کا ہے اور دوسرا روس کا۔ یوں تو امریکن بلاک کی طرح روس بھی اس سے متفق ہے کہ ایٹمی تجربات ختم ہو جانا چاہئیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر فریقین اس پر راضی بھی ہو جائیں تو اس کا یقین کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ وہ معاہدہ کی پابندی کریں گے۔ امریکن بلاک کنٹرول کی شرط لگانا ضروری سمجھتا ہے اور روس اس پر راضی نہیں۔ ہر چند روس نے اپنی طرف سے اعلان کر دیا ہے کہ وہ پہلی جنوری ۶۳ء سے ایٹمی دھماکے بند کر دے گا۔ لیکن وہ اس پر کسی حد تک عمل کرتا ہے یا یہ کہ اس کا ردِ عمل امریکن بلاک پر کیا ہوتا ہے اس کے متعلق ممکن ہے ۱۵ر جنوری ۱۹۶۳ء کی کانفرنس میں کوئی رائے قایم کی جا سکے۔

یمن

جمہوریہ یمن کی تخلیق اپنی جگہ اچھی ہو یا بری، لیکن اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ عرب لیگ ہنوز رقیق حالت میں ہے اور اس نے اب تک کوئی ایسی ہیئت اختیار نہیں کی، جو عرب حکومتوں کو ایک دوسرے سے متحد کر سکے۔ عرب لیگ کے قیام کے بعد وہاں کی سیاسی فضا میں کبھی سکون کی صورت پیدا نہیں ہوئی اور آئے دن کوئی نہ کوئی اختلاف پیدا ہوتا ہی رہتا ہے جس کی تازہ ترین مثال انقلاب یمن ہے۔ گو امام بدر یمن سے نکال دئے گئے ہیں لیکن انکی جماعت ہنوز بر سر پیکار ہے اور جمہوریہ یمن یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس کا مستقبل یکسر خطرات سے پاک ہے۔

امریکہ اور روس دونوں یمن کی انقلابی حکومت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ سعودی عرب اور اردن نے بھی اس کا وعدہ کر لیا ہے کہ وہ یمن کی سرحد پر جنگ بند کر دینگے، متحدہ عرب جمہوریہ بھی اپنی دس ہزار فوج وہاں سے ہٹانے کے لئے آمادہ ہے، لیکن جب تک امام بدر کا وجود باقی ہے، یمن کو امن وچین نصیب نہیں ہو سکتا۔

خریداران نگار

اگر آپ کا چندہ فروری ۶۳ء میں ختم ہو رہا ہے تو از راہ کرم ۲۵ فروری تک سالانہ چندہ دس روپے چالیس پیسے (مع مصارف رجسٹری، سالنامہ ۶۳ء) بھیجدیں۔ وی پی سے طلب کرنے کی صورت میں آپ کو زاید دینا پڑے گا۔ اسی کے ساتھ آپ "ہندی شاعری نمبر" (جس کی قیمت چار روپیہ ہے) صرف دو روپیہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۶۲ء میں ختم نہیں ہوتا۔ اور آپ سالنامہ ذریعہ رجسٹری منگوانا چاہیں تو چالیس پیسے کے ٹکٹ (مصارف رجسٹری) ضرور بھیجیں۔ ورنہ سالنامہ کے گم ہو جانے کی صورت میں دوبارہ ترسیل نہ ہوگی۔ ہر نیا خریدار "ہندی شاعری نمبر" رعائتی قیمت پر حاصل کر سکتا ہے۔

مچلن ٹائر

واحد تقسیم کنندگان برائے مغربی پاکستان

اسٹیل برادرس اینڈ کمپنی لمیٹڈ

کراچی ۔ لاہور ۔ راولپنڈی ۔ پشاور

حافظ کے بعض واقعاتی، تلمیحی و تفاولی اشعار

(نیاز فتحپوری)

دنیا کے ہر شاعر کے کلام میں کچھ نہ کچھ اشعار ضرور ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی حد تک اس عہد کی تاریخ یا مخصوص واقعات سے ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ شیرازی کے یہاں بھی ہم کو متعدد اشعار ایسے ملتے ہیں جن کے سمجھنے کے لئے اس وقت کی تاریخ کا اجمالی علم ضروری ہے۔

مولانا شبلی نے شعر العجم میں اور براؤن نے اپنی انگریزی تالیف "تاریخ ادبیات ایران" میں بسلسلۂ تذکرۂ حافظ اس کے بعض اشعار کے تاریخی پہلو کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کا اقتباس غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

حافظ کو اپنے عہد کے متعدد امراء و سلاطین کی سرپرستی حاصل تھی جن میں ایک "شاہ ابو اسحاق انجو" بھی تھا جو غازان خاں کے زمانہ میں فارس کی گورنری پر مامور تھا۔ ابو اسحاق شاعر بھی تھا اور شعراء کا قدرشناس بھی، لیکن تھا بڑا رند مشرب و عیش پرست انسان اور امور سلطنت کی طرف سے غافل و بے پروا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صرف چند سال شیراز پر حکومت کر سکا اور آخر کار مبارز الدین محمد بن مظفر نے جو اس کا دیرینہ رقیب تھا اسے گرفتار کر کے ۷۵۸ھ میں قتل کر دیا۔

حافظ کو بھی قدرتاً اس واقعہ سے متاثر ہونا چاہیئے تھا اور اپنے اس تاثر کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا:۔

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی   خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

حافظ نے اس عہد کے پانچ اور اکابر علم و فضل کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

بہ عہد سلطنت شاہ شیخ ابو اسحاق   بہ پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد
نخست پادشہے ہمچو او ولایت بخش   کہ جاں پرورد و داد عیش بداد
دوم بقیۂ ابدال شیخ امین الدین   کہ بود داخل اقطاب و مجمع اوتاد
سوم چو قاضی عادل اصیل ملت و دیں   کہ قاضئے بہ از و آسماں ندارد یاد
دگر چو قاضی فاضل عضد کہ در تصنیف   بنائے "شرح مواقف" بنام شاہ نہاد
دگر کریم چو حاجی قوام دریا دل   کہ او بجود چو حاتم ہمی صلہ می داد
نظیر خویش نہ بگزاشتند و بگزشتند   خدائے عز و جل جملہ را بیامرزاد

حافظ نے حاجی قوام کے جود و سخا کا ذکر دوسری جگہ بھی اس طرح کیا ہے:۔

دریائے اخضر فلک و کشتی ہلال   ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

حاجی قوام کے مفصل حالات کا پتہ نہیں چلتا، تاہم حافظ نے جن الفاظ میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد ابو اسحاق کے بڑے سر برآوردہ امیر تھے۔

ابو اسحاق کے بعد مظفر الدین محمد بن مظفر ۷۵۴ھ سے ۷۵۹ھ تک شیراز کا حکمراں رہا۔ یہ بڑا سخت گیر مذہبی انسان تھا اور اس کے عہد میں ذکرِ مے و میخانہ بھی داخلِ جرم تھا۔ حافظ اس زمانے میں بہت دلگیر رہے اور اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا۔

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیزست — بہانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیزست
در آستین مرقع پیالہ پنہاں کن — کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریزست
زرنگ بادہ بشوئید خرقہ ہا از اشک — کہ موسمِ ورع و روزگار پرہیزست

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ہرچند حافظ اس وقت بھی اپنی "آستین مرقع" میں جام و مینا چھپا کر کبھی کبھی شغل بادہ کر لیتے تھے لیکن وہ اس احتساب سے بہت دل تنگ اور اس دورِ گیر و دار کے اختتام کی بڑی سخت تمنا اپنے دل میں رکھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:۔

بود آیا کہ درِ میکدہ ہا بکشایند — گرہ از کارِ فرو بستۂ ما بکشایند
گیسوئے چنگ ببرید بہ مرگ مئے ناب — تا ہمہ مغبچہ ہا زلف دوتا بکشایند
نامۂ تعزیت دختر رز بنویسید — تا حریفاں ہمہ خوں از مژہ ہا بکشایند
درِ میخانہ ببستند خدایا مپسند — کہ درِ خانۂ تزویر و ریا بکشایند
اگر از بہر دل زاہد خود بیں بستند — دل قوی دار کہ از بہر خدا بکشایند

اس غزل کے آخری دو شعر بڑے پُرلطف ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ "ہرچند درِ میخانہ بند کر کے مکر و فریب کے دروازے کھول دئے ہیں، لیکن گھبرانے کی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اگر آج زاہد خود بیں کی خاطر سے میخانے کے دروازے بند کر دئے گئے ہیں تو کل خدا کی خوشنودی کے لئے انھیں پھر کھول دیا جائے"۔ اور آخر کار حافظ کی یہ دُعا قبول ہو کر رہی، کیونکہ مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع تخت نشین ہوا جو بالکل اپنے باپ کا ضد تھا۔ حافظ نے جس طرح لہک کر اس کا خیر مقدم کیا ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے:۔

سحر زہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش — کہ دورِ شاہ شجاع ست مے دلیر بنوش
شد آنکہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند — ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش
بہ بانگ چنگ بگوئیم آں حکایتہا — کہ از شنیدن آں دیگِ سینہ میزد جوش

یعنی اب زمانہ شاہ شجاع کا ہے اس لئے آؤ کھلم کھلا شراب پئیں اور مے و مینا کی باتیں جو پہلے دل سے زبان تک نہ آسکتی تھیں اب پوری آزادی کے ساتھ کریں۔

حافظ شاہ شجاع سے اتنے خوش تھے کہ بار بار اپنے جذباتِ مسرت کے اظہار پر مجبور ہو گئے چنانچہ ایک شعر میں انھوں نے اس عہد کے ذوق رقص و موسیقی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ:۔

بہ بیں کہ رقص کناں می رود بہ نالۂ چنگ — کسے کہ اذن نمی داد استماع سماع

اور شغل نغمہ و بادہ کی رخصت عام کو اس طرح سراہا ہے:۔

چنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر — جام در قہقہہ آمد کہ کجا شد مناع

لیکن فلک بد بیں حافظ کے اس فراغ خاطر کو زیادہ عرصہ تک نہ دیکھ سکا اور "عماد فقیہہ کرمانی" نے شجاع کو حافظ سے بدظن

کردیا۔ یہ بڑا زاہد و متعصب انسان تھا اور حافظ کی زندی و آزادہ روی کا سخت مخالف۔ حافظ نے شاہ شجاع کی بدگمانی اور برہمی کو یقیناً بہت محسوس کیا ہوگا، لیکن وہ فقیہہ کرمانی سے صلح نہ کرسکے بلکہ اس کے خلاف طنز و طعن سے بھی کام لیا۔

صوفی بہ جلوہ آمد و آغاز ناز کرد بنیاد مکر بافلک حقہ باز کرد

اے کبک خوش خرام کہ خوش میروی بناز غرہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

ان اشعار میں حافظ نے "عماد فقیہہ" کو شعبدہ باز قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی بلی کو ایسا سدھا لیا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ نماز پڑھتی تھی اور شاہ شجاع اس واقعہ کو عماد کی کرامت سمجھتا تھا۔

رفتہ رفتہ باہمی تعلقات اس قدر خراب ہوگئے کہ شاہ شجاع اور فقیہہ کرمانی، حافظ کے خلاف کوئی شرعی قدم اٹھانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں حافظ نے ایک غزل کہی جس کا مقطع یہ تھا۔

گر مسلمانی از آنست کہ حافظ دارد وائے گر از پۓ امروز بود فردائے

اس کے مفہوم کو انھوں نے بیدینی کے مترادف قرار دیا اور حافظ کے خلاف شرعی گیر ودار کا سوال سامنے آگیا۔

حافظ پریشان ہوکر "مولانا زین الدین ابوبکر تیبا بادی" کے پاس گئے اور مشورہ طلب کیا انھوں نے کہا کہ اس شعر سے بوئے الحاد ضرور آتی ہے لیکن اس مخمصہ سے جان چھڑانے کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اس مقطع کے ساتھ ایک شعر اور ایسا لکھ دو جس سے معلوم ہوسکے کہ یہ خیال تمھارا نہیں بلکہ کسی اور کا ہے۔ چنانچہ حافظ نے مقطع کے ساتھ اس شعر کا اضافہ کردیا۔

ایں حدیثم چہ خوش آمد کہ سحرگہ می گفت بر در میکدہ باد ف و نئے ترسائے

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب حافظ کے مقطع پر مذہبی احتساب کا وقت آیا تو حافظ نے کہا کہ یہ میرا خیال نہیں ہے بلکہ کسی عیسائی کا ہے جس کا اظہار میں نے کردیا ہے۔

ہرچند حافظ ان واقعات سے بہت بددل ہوگئے تھے اور ہر وقت اپنے آپ کو خطرہ میں مبتلا پاتے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے اسی زمانے میں شاہ شجاع کا انتقال ہوگیا (۷۸۶ھ) اور چند سال بعد منصور نے اس کے بیٹے زین العابدین کو گرفتار کرکے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حافظ کے لئے یہ انقلاب بہت ساز گار ثابت ہوا اور اس کا خیر مقدم انھوں نے اس طرح کیا۔

بیا کہ رایت منصور پادشاہ رسید نوید فتح و ظفر تا بہ مہر و ماہ رسید

یہی وہ زمانہ تھا جب تیمور و حافظ کی ملاقات ہوئی اور اسی وقت کا یہ لطیفہ مشہور ہے کہ جب تیمور نے حافظ کے شعر۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

پر یہ کہا کہ "میں نے جس ملک کو اتنی تکلیفیں اٹھانے کے بعد حاصل کیا ہے، اسے تم صرف خال محبوب پر نثار کرنے کے لئے تیار ہو،" تو حافظ نے جواب دیا کہ "میری اس غلط بخشی ہی نے تو مجھے اس حالت تک پہنچا دیا ہے"۔

اس کے بعد مظفری اور جلائری عہد میں حافظ کی زندگی اطمینان سے بسر ہوئی اور "سلطان احمد ابن اویس" نے انھیں بغداد آنے کی دعوت بھی دی لیکن باوجود اس تمنا کے کہ "خرم آں روز کہ حافظ رہ بغداد کند" وہ شیراز نہ چھوڑ سکے۔ اور یہ صحیح عذر پیش کیا کہ

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر
نسیم باد مصلی و آب رکنا باد

حافظ کو ہندوستان آنے کی بھی دعوت دو مرتبہ دی گئی۔ ایک محمود شاہ بہمنی والیٔ دکن کی طرف سے، دوسری سلطان غیاث الدین فرمانروائے بنگال کی طرف سے۔ لیکن وہ یہاں نہ آسکے۔ محمود شاہ بہمنی نے تو ایک بڑی رقم بھی ان کو بھیجدی تھی اور وہ شیراز چھوڑ کر لار تک پہنچ بھی گئے تھے۔ لیکن خلیج فارس میں طوفان آجانے کے باعث وہ پھر شیراز واپس چلے گئے۔ اور محمود شاہ کو معذرت کے طور پر یہ غزل لکھ کر بھیجدی۔

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد ۔۔۔ بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
بکوئے مے فروشانش بجامے در نمی گیرند ۔۔۔ زہے سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد
بس آساں می نمود اول غم دریا ببوئے سود ۔۔۔ غلط کردم کہ یک موجش بصد گوہر نمی ارزد

آخری شعر میں اسی طوفان کی طرف اشارہ ہے جس نے انھیں ہندوستان آنے سے باز رکھا، دعوت بنگال کا بھی قریب یہی حشر ہوا اور حافظ نے صرف ایک غزل بھیجکر اپنی جان چھڑائی۔ جس کے دو شعر یہ ہیں۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین
غافل مشو کہ کار تو از نالہ می رود

اسی غزل کا وہ شعر بھی ہے جس کے مفہوم کے بابت لوگوں میں اختلاف ہے:۔

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود
ویں بحث با "ثلاثۂ غسالہ" می رود

بعض کا خیال ہے کہ سرو، گل، لالہ، سلطان کی تین کنیزوں کا نام تھا جن کو حافظ نے اس تصور کی بنا پر "ثلاثۂ غسالہ" کہا ہے کہ وہ اپنے حسن و جمال کے لحاظ سے غم ربا تھیں۔ بعض نے "ثلاثۂ غسالہ" کا مفہوم وہ جرعہ ہائے شراب قرار دیا ہے جو صبح کے وقت رات کا خمار دور کرنے کے لئے پئے جاتے ہیں۔

حافظ کے واقعاتی اشعار کے سلسلے میں بعض ان اشعار کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو انھوں نے اپنی بیوی اور اپنے ایک لڑکے کی وفات پر کہے تھے۔ بیوی کے متعلق یہ شعر:۔

آں یار کزو خانۂ ما جائے پری بود
سر تا قدمش چوں پری از عیب بری بود

اور لڑکے کی بابت یہ دو شعر:۔

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند ۔۔۔ چہ دید اندر خم ایں طاق رنگیں
بجائے لوح سیمیں در کنارش ۔۔۔ فلک بر سر نہادش لوح سنگیں

دوسرے لڑکے کی وفات کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے:۔

صباح جمعہ بُد و سادس ربیع نخست ۔۔۔ کہ از دلم رُخ آں ماہ روے شد زایل

بہ سال ہفت صد و شصت و چار از ہجرت چو آب گشت بمن حل حکایت مشکل

بعض کا خیال ہے کہ حافظ نے شادی نہیں کی تھی ۔ بعض نے ان کی بیوی کا نام "شاخ نبات" بتایا ہے جس سے پہلے انھیں محبت ہوگئی تھی اور جس کا نام بھی انھوں نے اپنے ایک شعر میں "شاخ نباتم دادند" کہہ کر ظاہر کر دیا تھا ۔ بہر حال ان کی بیوی کا نام "شاخ نبات" ہو یا کچھ اور، انھوں نے شادی ضرور کی تھی جس کا بڑا ثبوت وہ اشعار ہیں جو انھوں نے اپنے بیٹوں کی وفات پر نظم کئے تھے۔

خزانۂ عامرہ کے مؤلف غلام علی آزاد بلگرامی کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کا ایک بیٹا شاہ نعمان ہندوستان بھی آیا تھا جس نے برہان پور میں وفات پائی اور اسیر گڈھ میں مدفون ہے ۔

حافظ کے واقعاتی اشعار میں چند ایسے بھی ہیں جو بعض امراء و سلاطین کی مدح سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ اس قدر کم ہیں کہ ان کے پیش نظر ہم نہ حافظ کو قصیدہ گو شاعر کہہ سکتے ہیں اور نہ ان اشعار کو حقیقت و صداقت ۔

حافظ اپنے مخصوص لب و لہجہ اور آہنگ و ترنم کے لحاظ سے خالص غنائی شاعر تھے اور اپنے اس رنگ شاعری پر انھیں خود بھی ناز تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں :

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ
بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری

وہ خمریات کے لحاظ سے بھی خاص شہرت رکھتے تھے ۔ لیکن فارس میں یہ رنگ بہت عام تھا اور حافظ نے اس میں کوئی خاص ندرت پیدا نہیں کی ۔ ایلغانی مغلوں کے دور کا ایک متقدم العہد شاعر عراقی، اس رنگ میں ایک ایسا شعر کہہ گیا ہے جو حافظ کے تمام خمریاتی کلام پر بھاری ہے ۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
ز چشم مست ساقی وام کردند

حافظ کی یہ خصوصیت کہ ان کے کلام سے تفاول بھی کیا جا سکتا ہے (گو میں خود اس کا قائل نہیں) بڑی عجیب و غریب بات ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر انھیں "لسان الغیب" و "ترجمان الاسرار" کہا جاتا ہے ۔ ان کے کلام سے فال نکالنے کے واقعات اس قدر کثرت کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں کہ ان سب کو جمع کرنے کے لئے پورا دفتر درکار ہے ۔ لیکن اس وقت ان تمام روایات و حکایات سے قطع نظر براؤن کا صرف وہ بیان میرے سامنے ہے جو رسالۂ "لطائف غیبیہ" کے متعلق انھوں نے اپنی "تاریخ ادبیات ایران" میں کیا ہے ۔ یہ رسالہ کسی شخص "محمد بن محمد دارابی" کا ہے جو ایران کے برطانوی سفارتخانہ میں ان کی نگاہ سے گزرا تھا اور طہران ہی میں چھپا تھا (۱۳۰۴ھ) اس رسالہ میں اس نے ان اعتراضات کا جواب دینے کے بعد جو حافظ کے بعض اشعار پر کئے جاتے ہیں، تفاول کے بھی چند واقعات درج کئے ہیں جو بڑی حد تک روایات سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر انھیں صحیح نہ باور کیا جائے تو بھی وہ دلچسپ ضرور ہیں ۔

پہلی روایت (حسب بیان براؤن) شاہ اسماعیل (بانی صفویہ خاندان) سے تعلق رکھتی ہے جس نے سب سے پہلے شیعی مذہب کو مذہب حکومت قرار دیا اور بعض اکابر کے مقابر کو مسمار کر دینا چاہا ۔

اسی زمانے میں کسی شیعی "ملا مگس" نے (جو شاہ اسماعیل کا بہت مقرب تھا) مزار حافظ کی مسماری کی طرف بھی توجہ کیا کیونکہ حافظ بے دین شاعر مشہور تھا ۔ شاہ اسماعیل نے اس باب میں دیوان حافظ سے تفاول کیا تو یہ شعر نکلا :

جو ز اسحر نہاد حمایل برابرم یعنی غلام شاہم و سوگند می خورم

شاہ اسماعیل نے اس سے یہ مفہوم اخذ کیا کہ حافظ اس کے تابع و فرمانبردار ہیں اور خوش ہو کر دوبارہ دیوان کھولا تو یہ شعر سامنے آیا،

اے مگس حضرت سیمرغ نہ جولانگہ تست
عرض خود می بری و زحمت ما میداری

اس تفاول کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ "ملا مگس" سے متنفر ہو گیا، کیونکہ اس میں صاف صاف مگس کا نام لے کر اس پر تعریض کی گئی تھی،

دوسرا واقعہ شاہ طہماسپ کے تفاول کا بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس کی ایک نہایت قیمتی انگوٹھی گم ہو گئی اور کامل جستجو کے بعد بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ آخر کار دیوانِ حافظ سے تفاول کیا گیا تو یہ شعر نکلا:۔

دلے کہ غیب نماہست و جام جم دارد
زخاتمے کہ دمے گم شود چہ غم دارد

بادشاہ نے خوش ہو کر زور سے اپنی ران پر ہاتھ مارا تو انگوٹھی جو عبا کی کسی شکن میں پھنس گئی تھی باہر آپڑی۔

تیسرا واقعہ شاہ عباس ثانی سے متعلق ہے اور اس زمانے کی بات ہے جب وہ آذربیجان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے دیوان حافظ سے تفاول کیا تو یہ شعر سامنے آیا۔

عراق و فارس گرفتی بہ شعرِ خود حافظ
بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز ست

اس شعر کو فال نیک سمجھ کر اس نے فوج کشی کر دی اور کامیاب ہوا۔

چوتھا واقعہ بھی اسی بادشاہ سے متعلق ہے۔ اس کا ایک محبوب غلام تھا "سیاوش" نامی۔ دوسرے خدام بربنائے رشک اس فکر میں تھے کہ اس کو کسی بڑے جرم کا مرتکب قرار دے کر قتل کرا دیں۔ چنانچہ ایک دن کوئی بہانہ اس کا مل ہی گیا اور بادشاہ اس کے قتل پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن مزید تحقیق کی غرض سے جب اس نے دیوانِ حافظ سے استصواب کیا تو اس میں یہ شعر نکلا:۔

شاہِ ترکاں، سخن مدعیاں می شنود
شرمے از مظلمۂ خون سیاوشش باد

اس سے زیادہ صاف جواب جس میں "سیاوش" اور اس کی بیگناہی دونوں کا ذکر تھا اور کیا ہو سکتا تھا۔

پانچواں واقعہ خود مصنف کا تجربہ ہے اور وہ یہ کہ جب وہ احمد آباد (پایۂ تخت گجرات) پہنچا تو وہاں کے ایک امیر کنعان بیگ سے متعارف ہو گیا۔ اس کا ایک بھائی یوسف بیگ کسی مہم پر گیا اور عرصہ تک اس کا پتہ نہ چلا۔ آخر کار اس نے دیوان حافظ سے تفاول کیا تو یہ شعر نکلا:۔

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

اور ہوا بھی یہی کہ چند دن بعد یوسف بیگ اپنے بھائی کنعان بیگ کے پاس لوٹ آیا۔

چھٹا واقعہ فتح علی سلطان کا ہے جو امام قلی خاں کا بڑا حسین بیٹا تھا۔ ایک بار یہ زرق برق لباس میں مزار حافظ پر گیا۔ دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا:۔

سرمست با قبائے زر افشاں چو بگزری
یک بوسہ نذر حافظ پشمینہ پوش کن

اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ مجھے ایک بوسہ کیا دو بوسوں سے بھی عذر نہیں اور بغیر بوسہ دئے ہوئے چلا گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ پھر مزار حافظ پر آیا اور دیوان کھولا تو یہ شعر سامنے آیا:۔

گفتہ بودی کہ شوم مست و دو بوست بدہم
وعدہ از حد بشد و ما نہ دو دیدیم و نہ یک

اس نے کہا کہ دو بوسے کیا میں تین بوسوں کے لئے آمادہ ہوں اور پھر بوسہ دئے بغیر چلا گیا۔ کچھ دن گزرنے کے بعد وہ تیسری مرتبہ پھر آیا اور دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا:۔

سہ بوسہ کز دو لبت کردۂ حوالت من
اگر ادا نہ کنی قرضدار من باشی

اور آخر کار فتح علی بیتاب ہو کر مزار حافظ کو بوسہ دینے پر مجبور ہو گیا۔

براؤن نے اس کے بعد دیوان حافظ کے اس نسخہ کا ذکر کیا ہے جو کسی وقت جہانگیر کی ملکیت تھا اور جس کے حاشیہ پر اس نے اپنے قلم سے خود اپنے تجربات تفاؤل تحریر کئے ہیں۔ یہ نسخہ بانکی پور کی لائبریری میں موجود ہے۔

تفاؤل کا وہ مشہور واقعہ بھی براؤن نے درج کیا ہے کہ جب حافظ کی وفات کے بعد ان کی تدفین کا سوال سامنے آیا اور مسلمانوں کے گورستان میں دفن کئے جانے کے متعلق بعض لوگوں نے اعتراض کیا تو ان کے دیوان سے تفاؤل کیا گیا اور اس شعر نے ان کے مخالفین کی زبان بند کر دی۔

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ
کہ گرچہ غرق گناہ است می رود بہ بہشت

دیوان حافظ سے تفاؤل کی بنیاد محض وہم خوش عقیدگی پر قائم ہے اور حقیقت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کے کلام کی عام مقبولیت کے پیش نظر، میں ان کی اس پیش گوئی کا ضرور قائل ہوں کہ

بہ شعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

لیکن اس سے آگے تفاؤل وغیرہ کی جو داستانیں بیان کی جاتی ہیں ان کا میں قائل نہیں کیونکہ ان میں سے اکثر تو موضوع ہیں اور بعض جو موضوع نہیں ہیں ان کا تعلق بھی اشعار حافظ سے کم اور متفاؤلین کی تاویل اور جستجوئے تسکین سے زیادہ ہے

اول اول ایران ہی کے بعض صوفی درویشوں نے حافظ کو "لسان الغیب" مشہور کیا اور رفتہ رفتہ یہ خیال عالمگیر ہو گیا، یہاں تک کہ بعض خوش عقیدہ حضرات نے باقاعدہ فالنامے تصنیف کر ڈالے چنانچہ حسب بیان براؤن بانکی پور کے نسخۂ دیوان حافظ میں بھی ایک فالنامہ ۲۲۵ مربع خانوں کا شامل ہے۔ فال دیکھنے کے طریقے مختلف ہیں۔ عام طریقہ یہ ہے کہ قرأت فاتحہ و درود کے بعد آنکھ بند کر کے دیوان کھولا جاتا ہے اور اولین صفحہ کے سب سے پہلے شعر سے تفاؤل کیا جاتا ہے۔ اگر وہ حسب منشا نہ ہو تو غزل

کے آخری شعر کو دیکھتے ہیں اگر وہ بھی مبہم ہوا تو اس کے بعد کی دوسری غزل کا پہلا یا آخری شعر لیتے ہیں اور جب اتفاق سے کوئی شعر مدعا کے موافق نہیں ملتا تو پھر ساتویں یا نویں صفحہ کی غزلوں کو دیکھتے ہیں اور اس کاوش کے بعد طفل تسلی کے لئے کوئی نہ کوئی شعر حسب مراد نکال ہی لیتے ہیں اور اسے حافظ کی پیش گوئی قرار دیتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ حافظ کی غزلوں میں اتنے مختلف و متنوع مضامین پائے جاتے ہیں کہ پورے دیوان کیا ان کی ہر غزل میں کوئی نہ کوئی شعر خاطر خواہ ضرور مل جاتا ہے۔ خاص کر اس صورت میں کہ آپ اس بات پر اڑ جائیں کہ کوئی نہ کوئی شعر ضرور اپنے مطلب کا ڈھونڈ نکالیں گے خواہ وہ کسی صفحہ یا کسی غزل کا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تفاول نہیں بلکہ دھینگا مشتی ہے جس سے کام لے کر، حافظ کیا ہر شاعر کے دیوان سے کوئی نہ کوئی شعر اپنے مطلب کا نکالا جا سکتا ہے۔ یہانتک کہ گلزار داغ اور دیوانِ جان صاحب سے بھی!۔

چند کتابیں (ہندوستانی ایڈیشن)

باقیاتِ غالب	وجاہت علی سندیلوی	۴۰/۳ روپے
گلزار داغ	داغ دہلوی	۴/۳۵
آفتاب داغ	" "	۲/۵۰
بزم داغ	رفیق مارہروی	۴/-
زبان داغ	" "	۴/۳۵
ادب کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۴/۳۵
مضامین شرر	عبدالحلیم شرر	۵/۶۰
گزشتہ لکھنؤ	" "	۵/۶۰
ناول کیا ہے	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۴/۳۵
اسلامی سوانح عمریاں	عبدالحلیم شرر	۳/۷۵

عرضِ نغمہ

ٹیگور مشرق کے ان بلند مرتبہ شاعروں میں ہے جس کے روح پرور نغموں نے مشرق و مغرب دونوں کو یکساں متاثر کیا ہے۔ علامہ نیاز فتحپوری نے اس عظیم فنکار کے مجموعہ نظم "گیت انجلی" کو عرض نغمہ کے نام سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ترجمہ ٹیگور کی روح شاعری سے اس درجہ ہم آہنگ ہے کہ اس میں وہی سادگی و پرکاری اور روح خیزی و دلکشی نظر آتی ہے جو ٹیگور کی شاعری میں ملتی ہے جو لوگ ٹیگور کی فنی دسترس شاعرانہ فطانت اور حیات پرور نغمات کی سحر آفرینیوں سے لطف اندوز ہونے کی آرزو مند ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے اس لئے کہ ٹیگور کی شخصیت اور فن سے بہرہ مند ہونے کے لئے اردو میں اس سے بہتر کوئی ترجمہ موجود نہیں ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے

اردو میں ترجموں کی نوعیت و اہمیت

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

(یہ مقالہ دراصل انگریزی میں ہے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر ادارہ نگار اسے اردو میں منتقل کر کے پیش کر رہا ہے)

کسی زبان کی ترقی میں ترجموں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نوزائیدہ اور ترقی یافتہ دونوں زبانوں میں علمی و فلسفیانہ ابلاغ و اظہار میں ترجمے بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ترجموں ہی کی مدد سے کوئی زبان ابتدا میں گرد و پیش کی زبانوں کا اثر دلفوذ قبول کرتی ہے۔ نئے الفاظ کا اخذ و انتخاب کرتی ہے۔ اور ترجموں ہی کی مدد سے اس میں بلحاظ ہیئت و معنے علمی و ادبی مباحث کے اظہار کا ذریعہ بننے کی صلاحیت و قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس باب میں زبان کا عمل بچوں کا سا ہوتا ہے وہ تقلید و مثال کی مدد سے آگے بڑھتی ہے۔ اور اپنے پھیلنے کی کسی ارتقائی منزل میں بھی خارجی اثرات سے بے نیاز نہیں رہتی۔ وہ اپنی ترقی کے لئے جس طرح رنگ و نسل و مذہب اور قوم و سیاست کے امتیازات کو نظر انداز کر کے اپنے گرد و پیش کے تجربات انسانی سے اکتساب کرتی ہے بالکل اسی طرح وہ دور دراز علاقوں کے ذہنی کارناموں اور نوع بنوع رجحانات کو بھی اخذ و جذب کے ذریعے اپنی وحدت میں سموتی رہتی ہے۔ اگر اکتساب و استفادہ کے یہ دروازے جو کہ ترجموں کی مدد سے وجود میں آتے ہیں، کسی زبان پر یکسر بند کر دیئے جائیں تو صرف یہ نہیں کہ اس زبان کی ترقی کے امکانات محدود ہو جائیں گے ـ ـ ـ ـ ـ بلکہ وہ یکسر ختم ہو جائے گی۔

اردو زبان و ادب کی ترقی میں بھی ترجموں کی روایت کو بڑا دخل رہا ہے کہ بات یہ ہے کہ اردو میں دوسری زبانوں کے مختلف عناصر اور صوت و آہنگ کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت فطری ہے۔ بلکہ ابھی اساس ہی ایک ایسی مخلوط بولی پر قائم ہے جو اب بھر تش پراکرت کی ایک شکل ہے۔ اور جو سندھ کی وادیوں سے لیکر دہلی کے گرد و نواح تک کبھی وقت بولی جاتی تھی۔ عربی، فارسی اور ترکی عناصر نے اس زبان سے مل کر ایک نئی زبان کو جنم دیا۔ ابتدا میں اسے ہندوی اور ہندی یا ریختہ زبان اردوئے معلی اور اردوئے معلی کہا گیا۔ لیکن آخر آخر اس کا نام اردو ٹھہرا۔ یہ نئی زبان بارہویں صدی عیسوی سے لیکر اگلی تین صدیوں تک ایک زندہ زبان کی حیثیت سے بولی جاتی تھی خاص طور پر مقامی باشندوں اور نو آمدہ مسلمانوں کے مابین اظہار خیال کا ذریعہ یہی زبان تھی۔ علمی و ادبی اور شاعرانہ کمالات کے لئے مسلمان بالعموم عربی، فارسی اور کبھی کبھی ترکی سے کام لیتے تھے۔ لیکن غیر مسلم عموماً قدیم پراکرت کی اسی شاخ کو کام میں لاتے تھے جس نے ادبی پراکرت کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ اور جس کی بنیاد پر علاقائی زبانیں یا بولیاں وجود میں آئی تھیں۔

روزمرہ کے استعمال میں کام آنے والی یہ زبان جو کہ معاشرتی اور کاروباری زندگی میں باہم اظہار خیال کا ذریعہ تھی تیزی سے ترقی کی جانب قدم بڑھاتی رہی اسکی ترقی کا پہلا دور وہ ہے جسے دکنی عہد کہا جاتا ہے۔ دکن میں جوں ہی بہمنی خاندان کی حکومت مستحکم ہوئی۔ فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس سے اردو کی ترقی کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ لیکن زندگی کے جس شعبے سے سب سے پہلے یہ متاثر ہوئی وہ مذہب تھا۔ بات یہ ہے کہ دکن میں مسلمان صوفیہ اور

علماء کا جو گروہ موجود تھا۔ اس نے مذہبی تبلیغ و تعلیم اور وعظ و ہدایت کے لئے اسی زبان کا انتخاب کیا۔

اگرچہ اس عہد کی طبع زاد کتابیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ لیکن کثیر تعداد ترجموں کی ہے ان ترجموں سے ایک طرف اس زمانے کے ذہنی رجحانات اور ادبی مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف زبان کی توسیع کے سلسلے میں ترجموں کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس ابتدائی دور میں جو ترجمے بھی ہوئے ان میں سے چند اہم ترجمے یہ ہیں۔

۱۔ نشاط العشق (عربی) از سید محی الدین عبد القادر جیلانی ترجمہ سید عبد اللہ حسینی ۸۳۸-۹۲ھ
۲۔ تحفۃ النساء (فارسی) از خواجہ نصیر الدین ترجمہ قطبی سنہ ۱۰۴۴ھ
۳۔ احکام الصلوٰۃ (فارسی) ترجمہ عبد اللہ سنہ ۱۰۳۲ھ
۴۔ شمائل الاتقیاء (فارسی) از برہان الدین ترجمہ میراں یعقوب سنہ ۱۰۷۸ھ
۵۔ شرح تمہید ہمدانی۔ از شیخ احمد برادر امام غزالی، ترجمہ میراں جی حسن خدانما سنہ ۱۰۷۰ھ
۶۔ پنچھی باچا (فارسی منطق الطیر) از خواجہ فرید الدین عطار۔ ترجمہ وجدی سنہ ۱۱۳۱ھ
۷۔ تحفۂ عاشقاں (فارسی گل و ہرمز) از خواجہ فرید الدین عطار ترجمہ وجدی
۸۔ روضۃ الشہداء۔ (فارسی) از ملا حسین واعظ کاشفی ترجمہ ولی ویلوری
۹۔ روضۃ الانوار (فارسی) ترجمہ ولی ویلوری
۱۰۔ معرفت السلوک (فارسی) از شیخ محمود ترجمہ ولی اللہ قادری سنہ ۱۱۵۷ھ
۱۱۔ رسالہ حقائق (فارسی) ترجمہ شاہ میر سنہ ۱۱۹۷ھ
۱۲۔ مصباح الصلوٰۃ (عربی) ترجمہ قادر علی سنہ ۱۲۳۲ھ

ترجموں کے ذریعے اسلام، اسلامی تاریخ اور تصوف کا جتنا وافر لٹریچر اردو میں جمع ہو گیا ہے کسی اور علاقائی زبان میں نظر نہیں آتا۔ ابھی حال میں انجمن ترقی اردو کراچی سے جو قاموس الکتب شائع ہوئی ہے۔ اس میں قرآن پاک کے ۵۹ مختلف مستند ترجموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں شاہ عبد القادر، شاہ رفیع الدین اور شاہ حقانی کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ جدید ترجموں میں مولوی نذیر احمد کا ترجمہ اس حلقے میں بہت مقبول ہے۔ جو روزمرہ پر جان دیتے ہیں۔ اشرف علی تھانوی کا ترجمہ بھی مقبول عام ہے۔ فن قرأت یعنی تجوید پر بھی کئی اچھے ترجمے موجود ہیں۔ قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں بھی طبع زاد ترجموں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ جن میں بعض اہم ترجمے یہ ہیں۔

۱۔ تفسیر ابن العربی ترجمہ امیر حسن خاں سہا
۲۔ جواہر التفسیر از علامہ مجد دین خاصا شیرازی ترجمہ نامعلوم
۳۔ خلاصۃ المنہاج از شیخ فتح اللہ کاشانی ترجمہ زیر نگرانی سید محمد حسین
۴۔ جواہر تفسیر از علامہ شیخ ناتنوی جوہری ترجمہ عبد الرحمٰن رحمانی
۵۔ البیضاوی مطبوعہ قاسمی پریس دیوبند
۶۔ مواہب عالیہ، از ملا حسین واعظ کاشفی ترجمہ قاری فخر الدین
۷۔ تفسیر کبیر از امام فخر الدین رازی۔ ترجمہ محمد اسحٰق
۸۔ تفسیر ابن کثیر۔ ترجمہ محمد بن ابراہیم جوناگڈھی۔

۹۔ "تفسیر ابن عباس" ترجمہ محمد رمضان اکبر آبادی

۱۰۔ "جلالین" ترجمہ واصف غلام مہدی

۱۱۔ تفسیر سورۃ النور از علامہ ابن تیمیہ، مترجمہ ابو محمد ابراہیم

۱۲۔ تفسیر سورۃ یوسف از امام غزالی مترجمہ اشرف علی کندھالوی

۱۳۔ تفسیر سورۃ البقر از علامہ محمد عبیدہ مصری مترجمہ بدر الدین فاروقی

۱۴۔ تفسیر سورۃ اخلاص، از بو علی سینا۔ مترجمہ عبدالاحد

۱۵۔ تفسیر فتح العزیز از شاہ عبدالعزیز دہلوی

۱۶۔ تفسیر المواعظتین از امام ابن تیمیہ مترجمہ عبدالرحیم پشاوری۔

۱۷۔ تفسیر سورۃ کوثر، از ابن تیمیہ۔ ترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی

۱۸۔ تفسیر ربیعی، از خواجہ یعقوب، مترجمہ عبدالرزاق بن سید نجف علی

۱۹۔ تفسیر سورۃ البقر۔ از خواجہ یعقوب۔ مترجمہ شاہ رفیع الدین

۲۰۔ تفسیر کبیر۔ از امام فخرالدین رازی مترجمہ انشاء اللہ اور محمد داؤد

۲۱۔ سورۃ مزمل و مدثر از شاہ ولی اللہ

۲۲۔ تفسیر سورۃ آیۃ الکرسیہ از ابن تیمیہ

۲۳۔ سورۃ اخلاص از امام ابن تیمیہ مترجمہ غلام ربانی۔

اصول تفسیر کے موضوع پر جو اہم کتابیں عربی فارسی سے اردو میں منتقل کی گئیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ اصول تفسیر از ابن تیمیہ مترجمہ مولانا خالد۔ مطبوعہ بھوپال

۲۔ الفوز الکبیر از شاہ ولی اللہ مترجمہ رشید احمد انصاری مطبوعہ دہلی۔

۳۔ اصول تفسیر از تیمیہ۔ مترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ مطبوعہ لاہور

۴۔ اتقان فی العلوم القرآن از علامہ جلال الدین سیوطی مترجمہ محمد حلیم انصاری مطبوعہ مرزاپور

علم القرآن کے موضوع پر ذیل کے اہم ترجمے یا خلاصے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ حکمت قرآن از محمد مختار پاشا

۲۔ نہایت البیان

۳۔ اسرار التنزیل۔ از امام رازی

علوم اسلامی کی ایک اہم شاخ حدیث بھی ہے۔ اس موضوع کے اہم ترجموں کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ المنبہات۔ از علامہ ابن القضاۃ "احمد بن محمد" ترجمہ حماد کراچی سنہ ۱۹۵۷ء

۲۔ بخاری شریف۔ مترجمہ ابوالبرکات

۳۔ خصائص نسائی۔ مترجمہ ابوالحسن

۴۔ بخاری شریف۔ مترجمہ ابوسعید بن عبدالرحیم

۵۔ کتاب الاسرار۔ مترجمہ ابوالفتح عزیزی شرف الدین

۶۔ ریاض الصالحین از امام محی الدین ابوزکریا مترجمہ احمد الدین

۷۔ سنن ابن ماجہ۔ مترجمہ ابوسعید

۸۔ الہدایۃ السنۃ فی الحدیث۔ مترجمہ ابوسعید

۹۔ ترغیب و ترہیب، از علامہ منذری مترجمہ ابوسعید

۱۱۔ مشکوٰۃ المصابیح

۱۲۔ صحاح ستہ۔ مترجمہ احمد علی

۱۳۔ مسند امام ابوحنیفہ مترجمہ احمد علی

۱۴۔ موطا از امام محمد

۱۵۔ بلوغ المرام۔ از حافظ احمد بن علی حجر

۱۶۔ جامع کنوز الحقائق فی حدیث خیر الخلائق مترجمہ ابوالخیر خیر اللہ

۱۷۔ شمائل ترمذی۔ مترجمہ سید بابا قادری

۱۸۔ کتاب العصر۔ مترجمہ صغیر الدین

۱۹۔ مسلم۔ مترجمہ عبدالاحد۔

یہ فہرست نامکمل ہے۔ اس قسم کے ترجموں کی تعداد کثیر ہے۔ اور بعض بعض کتابوں کے کئی کئی ترجمے کئے گئے ہیں۔ اسلام ہی نہیں بلکہ غیر اسلامی لٹریچر اور دوسرے مذاہب سے متعلق بھی اردو میں بکثرت ترجمے موجود ہیں۔ عیسائیوں کی مقدس کتاب انجیل کے حسب ذیل اردو ترجمے ملتے ہیں۔

۱۔ عہد نامہ قدیم۔ مطبوعہ منجانب مشنری
۲۔ عہد نامہ جدید۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۹ء
۳۔ عہد نامہ قدیم عہد نامہ جدید مطبوعہ لندن ۱۸۶۰ء
۴۔ عہد نامہ قدیم و عہد نامہ جدید مطبوعہ لدھیانہ ۱۸۷۰ء
۵۔ کتب مقدس کا احوال۔ مطبوعہ لدھیانہ ۱۸۴۳ء
۶۔ عہد نامہ قدیم۔
۷۔ عہد نامہ جدید۔ مطبوعہ نول کشور ۱۹۰۹ء
۸۔ یحییٰ نبی کی کتاب۔ مطبوعہ لدھیانہ ۱۸۶۰ء

اس کے علاوہ عیسائی مذہب کے متعلق انجیل کی تفسیر و تشریح کے سلسلے کی بھی متعدد کتابیں ترجمہ کی گئی ہیں۔ یہودی مذہب پر لکھی ہوئی بھی کئی کتابیں اردو میں منتقل کی جا چکی ہیں۔ ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والی اہم کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ سام وید۔ مترجمہ آنند سروپ دھرم پال میرٹھ ۱۸۹۶ء
۲۔ یجر وید۔ مترجمہ رام جگن ناتھ سرسوتی امرتسر ۱۹۲۰ء
۳۔ رگ وید۔ " رام جگن ناتھ جالندھر ۱۸۹۸ء
۴۔ بھگوت گیتا " رام موہن۔ ہردوار ۱۹۲۳ء
۵۔ یگ وید۔ ادھ بھاش بھوم کا۔ مترجمہ دیانند سرسوتی جالندھر ۱۸۹۰ء
۶۔ پرکاش سر اکبر از دارا شکوہ۔ مترجمہ کنہیا لال ۱۹۶۱ء
۷۔ رگ وید۔ مترجمہ لچھمن داس۔ دہلی ۱۸۳۷ء (نہال سنگھ نے بھی ایک ترجمہ کیا ہے)۔
۸۔ اتم پران۔ مترجمہ جگموہن پرکاش پریم۔ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ۔
۹۔ کیول گرنتھ۔ مترجمہ جگموہن لکھنؤ ۱۸۶۱ء
۱۰۔ سوبلاج پران۔ مترجمہ ویاس جی
۱۱۔ وشنو پران۔ مترجمہ امر ناتھ سحر علی گڈھ ۱۹۱۵ء
۱۲۔ گنیش پران۔ سنکر دیال
۱۳۔ گنیش پران " شنکر دیال فرحت مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۳ء
۱۴۔ بشن پران۔ مترجمہ گنیش داس۔
۱۵۔ کلنکی پران۔ ہردیال شرما میرٹھ و مراد آباد ۱۸۹۷ء

علاوہ ازیں بھگتی تحریک، شاستر، اپنشد، ساگر ۔ پرکاش۔ ہندو تصوف سمرتی، منو۔ سوارتی، یوگ۔ گیا مہاتما۔ گیتا۔ دھرما۔ برہم چاریہ۔ مہابھارت، گیان کتھا۔ رامائن۔ آریہ مت، وغیرہ سے متعلق متعدد کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ چنانچہ ایسے ہندو جو کہ سنسکرت سے ناواقف ہیں۔ اور اپنے مذہب، فلسفہ، مذہب اور تاریخ مذہب کے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ وہ اردو کے ذریعہ نہایت وسیع اور مفید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے اردو ترجمے بدھ مت۔ جین مت ۔ کبیر پنتھی، سکھ مت۔ برہمو سماج۔ دیو سماج۔ رادھا سوامی مت وغیرہ کے سلسلے میں بھی موجود ہیں۔ اسی بنا پر یہ دعویٰ غلط نہیں ہے، کہ برصغیر کی ثقافتی اور تمدنی زندگی کی جتنی آئینہ داری اردو کرتی ہے۔ کوئی دوسری زبان نہیں کرتی یہ ضرور ہے کہ عربی و فارسی کی جگہ مسلمانوں نے اردو کو عموماً استعمال کیا ہے۔ اس زبان میں ان کے کارنامے اور ان کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ اس کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک مشترک ثقافتی ورثہ کی حیثیت سے اردو نے بلا امتیاز رنگ و نسل و مذہب ہماری نمائندگی کی ہے۔

مذہبیات سے قطع نظر، شعر و ادب کے میدان میں بھی اردو نے سارے قدیم ترین ماخذات سے استفادہ کیا ہے۔ اور آج بھی اس میں ہر زبان اور ہر صنف ادب کے بکثرت ترجمے موجود ہیں۔ اردو کے زمانہ فروغ میں اگرچہ سنسکرت زبان و ادب کے اثرات عملی طور پر سرد ہو چکے تھے۔ اور اس کا شمار زندہ زبانوں میں نہ ہوتا تھا۔ اس کے باوجود ادب کی سب سے قدیم اور سنسکرت کی سب سے مقبول اور اہم صنف داستان سے اردو نے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ غالباً سنسکرت کی ساری اہم ترین منظوم اور نثری داستانیں اردو میں منتقل کر لی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر کالیداس کی شکنتلا قدیم مصنفوں میں مرزا کاظم علی نے اور جدید ادیبوں میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے براہ راست اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ طوطا کہانی نامی مقبول عام داستان عہد اکبری میں سنسکرت سے فارسی میں منتقل کی گئی۔ ضیاء الدین نخشبی بدایونی کے فارسی ترجمے کو ۱۰۹۲ھ میں غواصی نے دکنی اردو میں نظم کا جامہ پہنایا۔

ابوالفضل نے طوطی نامہ کا جو فارسی ترجمہ کیا تھا۔ اسے بھی دکن سے سید محمد قادری نے اردو میں ترجمہ کر دیا۔ سنسکرت کی طرح عربی سے بھی بہت سی کتابیں براہ راست ترجمہ کی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں الف لیلہ جیسی مشہور کتاب بھی شامل ہے۔ اس کا سب سے اچھا اردو ترجمہ وہ ہے جو ڈاکٹر منصور نے کیا ہے۔ عربی ناول اور افسانوں کے ترجمے آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حبیب اشعر نے بعض مصری کہانیوں کو بھی اردو میں منتقل کیا ہے۔ لیکن ترجموں کے سلسلے میں اردو نے جتنا استفادہ فارسی سے کیا ہے۔ کسی اور زبان سے نہیں کیا۔ تقریباً نثر و نظم کی ساری اہم اور قدیم علمی و ادبی کتابیں اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے کی قدیم ترین کتاب "سب رس" ہے جسے عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر ملا وجہی نے فارسی کے مشہور قصہ "حسن و دل" مصنفہ یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ فارسی کی قدیم کتابوں کے مندرجہ ذیل ترجمے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۱۔ گل و ہرمز۔ از فرید الدین عطار ترجمہ وجدی سنہ ۱۱۵۲ھ موسومہ بہ تحفۂ عاشقاں
۲۔ زلیخا
۳۔ قصہ ملک مصر
۴۔ چندر بدن و مہیار مترجمہ واقف
۵۔ انوار سہیلی۔ مترجمہ میاں محمد ابراہیم
۶۔ پھول بن۔ مترجمہ ابن نشاطی
۷۔ ہشت بہشت۔ مصنفہ امیر خسرو مترجمہ ملک خوشنود
۸۔ خاور نامہ، مصنفہ ابن حسام مترجمہ کمال خاں رستمی سنہ ۱۰۴۹ھ
۹۔ یوسف زلیخا، مترجمہ امین سنہ ۱۰۹۰ھ
۱۰۔ سیف الملوک و بدیع الجمال، مترجمہ غواص سنہ ۱۰۳۵ھ

فارسی کے ان ابتدائی ترجموں نے ابتدا میں اردو کو ترقی دینے اور اس کے ادبی معیار متعین کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ اردو شعرا نے عربی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ میں فارسی کی معنوی و صوری خصوصیات کا تتبع کیا ہے۔ عروض و اسلوب، ہیئت و مواد اور صنائع و بدائع کے استعمال سب میں فارسی کے اصول سامنے رکھے گئے ہیں۔ اسی لئے بعض لوگوں نے اردو شاعری کو فارسی کا چربہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ تنقید درست نہیں ہے۔ اردو نے تقلید، تتبع کے باوجود ایک انفرادی اسلوب اور لب و لہجہ برقرار رکھا ہے۔ ابتدا میں کسی معیار زبان و ادب —— کو بطور مثال اگر سامنے نہ رکھا جاتا تو شاید اردو میں ادبی و علمی روایات اس قدر مستحکم نہ ہوتیں حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی کا اثر ہے کہ اردو نے —— بہت جلد ایک ترقی یافتہ شاعرانہ اور ادبی زبان کی صورت اختیار کر لی۔

اردو ترجموں کے سلسلے میں دور حاضر تک پہنچنے سے پہلے چند اداروں کا ذکر خاص طور پر قابل ذکر ہے اس لئے کہ ترجموں کا معیاری اور اہم کام زیادہ تر انہیں کے ذریعہ ہوا ہے کہ اس قسم کا پہلا ادارہ فورٹ ولیم کالج ہے جو ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا اور جس سے ڈاکٹر گلکرائسٹ کی نگرانی میں اردو نثر نگاری کا باقاعدہ کام شروع ہوا۔ مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور ترجمہ کی گئیں۔ ترجموں میں مندرجہ ذیل اہم ہیں۔

۱۔ اخلاق محسنی از ملا حسین واعظ کاشفی مترجمہ میر امن (۱۸۰۲ء)
۲۔ قصہ لیلیٰ مجنوں از امیر خسرو مترجمہ حیدر بخش حیدری (۱۸۰۱ء)
۳۔ تاریخ جہاں کشائے نادری از مرزا محمد مہدی مترجمہ حیدری (۱۸۰۹ء)
۴۔ بہار دانش از شیخ عنایت اللہ مترجمہ حیدری
۵۔ آرائش محفل مترجمہ حیدری
۶۔ روضۃ الشہدا۔ از ملا حسین واعظ کاشفی مترجمہ حیدری ۱۸۰۴ء
۷۔ گلستان سعدی۔ مترجمہ شیر علی افسوس (۱۸۰۲ء)
۸۔ خلاصۃ التواریخ از سجان رائے مترجمہ شیر علی افسوس ۱۸۰۸ء
۹۔ مفرح القلوب، از مفتی تاج الدین مترجمہ بہادر علی حسینی ۱۸۰۲ء
۱۰۔ تاریخ آسام از طیش ابن ولی محمد ۱۸۰۵ء
۱۱۔ مادھونل کام کندلا از موتی رام، مترجمہ مظہر علی ولا ۱۸۰۳ء
۱۲۔ ہفت گلشن از ناصر علی خاں واسطی بلگرامی مترجمہ ولا ۱۸۰۲ء
۱۳۔ بیتال پچیسی، مترجمہ ولا۔
۱۴۔ جہانگیر نامہ، مترجمہ ولا
۱۶۔ تاریخ شیر شاہی از عباس خاں شیروانی، مترجمہ ولا ۱۸۰۵ء
۱۵۔ شکنتلا از کالیداس، مترجمہ کاظم علی جواں ۱۸۰۱ء
۱۷۔ ہدایت الاسلام از مولوی عنایت اللہ شیدا ۱۸۰۴ء
۱۸۔ اخلاق جلالی مترجمہ شیدا۔ مطبوعہ ۱۸۴۵ء
۱۹۔ خرد افروز مترجمہ شیخ حفیظ الدین ترجمہ عیار دانش کا ۱۸۰۵ء
۲۰۔ اکبر نامہ از شیخ ابوالفضل، مترجمہ خلیل علی خاں ۱۸۰۹ء

۲۱- رسالہ اخوان الصفا از اکرام علی ۱۸۱۰ء
۲۲- مذہب عشق از عزت اللہ بنگالی، مترجمہ نہال چند لاہوری ۱۸۰۳ء
۲۳- تنبیہ الغافلین از شاہ رفیع الدین مترجمہ بینی نرائن جہاں
۲۴- پریم ساگر۔ مترجمہ للو لال جی
۲۵- انجیل مترجمہ مرزا محمد فطرت

فورٹ ولیم کالج کے ان ترجموں سے اردو کو عربی فارسی کی تقلید سے ہٹاکر مخصوص اسلوب اور لب ولہجہ کا حامل بنانے میں بڑی مدد ملی ہے۔ چونکہ یہ ترجمے سیاسی سماجی اور تعلیمی ضرورتوں کے تحت کرائے گئے تھے۔ اور ان کے ذریعے حکومت عوام میں ایک رشتہ قائم کرنا تھا۔ اس لئے یہ ترجمے عموماً صاف، سادہ، اور شگفتہ زبان میں ملتے ہیں۔ سادہ، شگفتہ اور معنی خیز انداز بیان آگے چل کر غالب و سرسید کا رہنما بنا اور آخر آخر ان کی کوششوں سے علمی و ادبی نثر کا وہ اسلوب سامنے آیا۔ جسے جملہ علوم وفنون کے لئے آج بھی معیاری خیال کیا جاتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد ترجموں کا رواج عام ہوا۔ اداروں سے ہٹ کر انفرادی کوششوں سے بھی بعض اچھے ترجمے وجود میں آئے۔ مثلاً نواب فخر الدین (شمس الامراء) کو ریاضی اور فلکیات سے گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے سائنس کی متعدد کتابیں اردو میں منتقل کی ہیں۔ اداروں میں سب سے اہم دلی کالج ہے۔ یہ کالج ۱۷۹۲ء میں ایک معمولی مدرسے کی حیثیت سے ہوا۔ نواب غازی الدین حیدر کے ہاتھوں قائم ہوا تھا۔ جس نے ۱۸۲۵ء میں ایک جدید کالج کی صورت اختیار کرلی۔ ۱۸۲۹ء میں وزیر اودھ خان بہادر سید فضل علی خاں نے تقریباً دو لاکھ روپے سے ایک ٹرسٹ قائم کیا۔ اور چند دنوں کی کوششوں کے بعد یہ کالج دو شعبوں میں تقسیم ہوگیا۔ علوم شرقیہ اور علوم مغربیہ ۱۸۳۵ء میں ایک ایجوکیشنل کمیٹی قائم ہوئی۔ اور اس نے کالج کو اردو کی مغربیہ نصابی کتابیں فراہم کرنے کا اور لائحہ عمل تیار کیا۔ اور اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا۔ اس سوسائٹی کی سب سے پہلی کتاب ٹاکر بیٹے (Dr. Y. Rehmat) کی مرتبہ ایک ریڈر ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے دلی کالج پر جو کتاب لکھی ہے۔ اس میں اس سوسائٹی کی ۱۲۸ اہم کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو مغربی علوم خصوصاً سائنس کے سلسلے میں تالیف کی گئیں یا ترجمہ ہوئیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ کالج اپنی انفرادیت کھو بیٹھا اور آخر آخر ۱۸۷۷ء میں اسے لاہور کالج میں ضم کر دیا گیا۔ اس کالج کے نامور اساتذہ یا طلباء میں ماسٹر رام چندر۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا ذکاء اللہ اور محمد حسین آزاد کے نام خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

غالباً دلی کالج میں اردو ترجموں کا جو کام ہوا تھا۔ اسی کے زیر اثر سرسید نے ۱۸۶۲ء میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ ۱۸۶۴ء میں یہ سوسائٹی علیگڑھ سے غازی پور منتقل ہوگئی۔ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے اسے ایک پریس بنا دیا۔ اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ اس سوسائٹی نے مختلف علوم وفنون کی کوئی چالیس کتابیں ترجمہ کرائیں۔ سرسید نے … … لندن سے نواب محسن الملک کو جو خط لکھا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس سوسائٹی کے بقاء کی بڑی فکر تھی۔ لیکن ان کا انہماک علی گڑھ کی طرف کچھ ایسا ہوگیا کہ نہ اسکی طرف خاطر خواہ توجہ نہ کرسکے۔

سائنٹفک سوسائٹی کے بعد اردو ترجمے کا قابلِ قدر کام عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں یہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اور ۱۹۳۵ء تک کے مختصر عہد میں یہاں کے شعبہ تصنیف و تالیف نے مختلف علوم وفنون کے جو ترجمے شائع کئے ان کی تعداد ۲۹۸ ہے۔ کتابوں کے مصنفین اور مترجمین کے نام دینے کی یہاں گنجائش نہیں۔ صرف مختلف موضوعات پر کتابوں کی تعداد دی جارہی ہے۔

۱- تاریخ پاک و ہند	۳۹	۷- سیاسیات	۱۳	۱۳- منطق	۴	۱۹- طبیعات	۲۱
۲- تاریخ انگلستان	۷	۸- جغرافیہ	۵	۱۴- مابعد الطبیعات	۳	۲۰- کیمیا	۱۴
۳- تاریخ یورپ	۱۳	۹- آئین انگلستان	۴	۱۵- نفسیات	۱۲	۲۱- نباتات	۶
۴- تاریخ یونان	۸	۱۰- معاشیات	۱۳	۱۶- اخلاقیات	۱۱	۲۲- ڈاکٹری	۲۸
۵- تاریخ روم	۸	۱۱- سماجیات	۲	۱۷- قانون	۱۱	۲۳- انجینئرنگ	۳۹
۶- تاریخ اسلام	۱۸	۱۲- فلسفہ	۱۶	۱۸- ریاضی	۲۷		

عثمانیہ یونیورسٹی کے یہ ترجمے زبان و ادب اور تاریخ تعلیم میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان ترجموں کی مدد سے اردو کو یونیورسٹی میں ہر قسم کی تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا ہے اور اردو اس قابل ہو گئی کہ اس میں جدید سے جدید اعلیٰ تعلیم دی جا سکے۔ آج اصطلاح سازی اور اردو تدریس کے سلسلے میں زیادہ تر انھیں کتابوں سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ بعض غیر معروف اور کم مشہور چھوٹے چھوٹے اداروں میں بھی اردو ترجموں کا کام ہوا ہے لیکن چند ایک کے سوا سب کی تفصیل دینا یہاں ممکن نہیں ۱۸۵۰ء میں گورنمنٹ بک ڈپو لاہور قائم ہوا اور اس نے تعلیمی ضرورت سے متعدد کتابیں ترجمہ کرائیں۔ مولانا حالی اسی بک ڈپو میں اردو ترجموں کے مسودوں کی تصحیح پر مامور تھے۔ اور انھیں مغربی علوم و فنون اور اصول تنقید کا وہ شعور یہیں سے ملا۔ جو مقدمہ شعر و شاعری میں نظر آتا ہے۔ اسی بک ڈپو کے زیر اثر مولانا محمد آزاد نے نیرنگ خیال جیسی کتاب لکھی۔ اسی زمانے میں سرسید نے اسپکٹیٹر کے طرز پر تہذیب الاخلاق نکالا۔ اس میں اسٹیل واڈیسن کے مضامین کے ترجمے شائع ہوئے اور مختلف جدید علوم پر متعدد مقالات لکھے گئے اور ترجمہ کئے گئے۔

بیسویں صدی میں ترجموں کی رفتار کا جائزہ لیتے وقت چند ادارے اور بھی قابل ذکر ہیں۔ لاہور میں حکومت کی جانب سے ایک کمیشن مقرر ہے۔ جو اصطلاحی ترجموں کی فراہمی کا کام کرتا ہے۔ اس نے مختلف علوم کی اصطلاحات کی کئی فہرستیں شائع کی ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے تک پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی بھی اسی قسم کا کام کرتی تھی۔ اور اسکولوں اور کالجوں کے لئے نصابی کتابیں مہیا کرتی تھی۔ اس قسم کا زیادہ تر کام اب اردو اکیڈمی کرتی ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں بھی تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے نے مختلف علوم و فنون کے ماہرین پر مشتمل ہر مضمون و علم کی الگ الگ کمیٹیاں بنادی ہیں۔ اس ادارے نے اپنے مختصر قیام میں ترجموں کا جو کام کیا ہے۔ اسکی فہرستیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اور جریدہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس ادارے نے بعض قدیم علمی کتابوں کے ترجمے بھی شائع کئے ہیں۔

شعری و ادبی تخلیقات و تصنیفات کو اگرچہ کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اردو میں مختلف زبانوں کے بہت سے ادبی کارنامے نہایت کامیابی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ ناولوں کے ترجموں کا کام تو بیسویں صدی کے اوائل ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ ڈان کوسٹ کا ترجمہ رتن ناتھ سرشار نے کیا فاوسٹ کا ترجمہ جوالا پرشاد برق نے اور ٹیلس مین کا ترجمہ عبدالحلیم شرر نے کیا۔ اور بہت سے اہم انگریزی ناول ترجمہ کئے جا چکے ہیں۔ شیکسپیر کے ڈرامے کئی کئی ادیبوں نے ترجمے کئے ہیں۔ مختصر افسانوں کے ترجمے بکثرت ہوئے ہیں۔ اور آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی کے سارے اچھے افسانے ترجمہ کئے جا چکے ہیں۔ ڈراموں کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ روسی زبان کے ناول اور افسانے بھی انگریزی کے توسط سے اردو میں منتقل کئے جا رہے ہیں۔ عربی۔ فارسی۔ بنگالی اور انگریزی نظموں کے ترجمے بکثرت ہوتے ہیں۔

اردو میں ترجموں کا یہ خاکہ بہت مختصر اور نامکمل ہے۔ پھر بھی اس سے ترجموں کی رفتار و نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ان ترجموں نے اردو زبان و ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے درسی کتابوں کی فراہمی اور مختلف علوم و فنون کی تدریس و تعلیم میں ان سے بڑی مدد ملی ہے۔ معاشیات سیاسیات، نفسیات اور سائنسی علوم پر نئی کتابیں لکھنے کے لئے ان ترجموں نے نئی راہیں سجھائی ہیں۔ اس لئے انکی افادیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

★ ★ ★ ★

ایک خاتون لوہا بازار گئی۔ اور ایک دوکان دار سے کہا۔ کہ مجھے پلگ (Plug) چاہئیں، اس نے پوچھا کہ کون سا پلگ درکار ہے۔ نر یا مادہ یا دونوں (یعنی چھوٹا یا بڑا)۔ اس نے کہا کہ مجھے صرف ایک پلگ سوراخ بند کرانے کے لئے درکار ہے۔ میں اس کی نسل بڑھانا نہیں چاہتی۔

★

سب سے اعلیٰ سیمنٹ

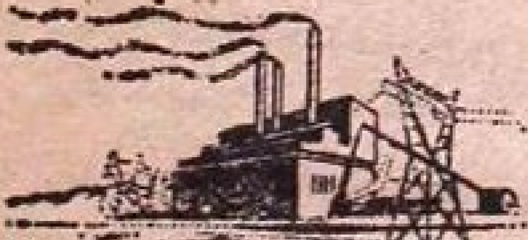

میپل لیف سیمنٹ عمدگی
کے بلند ترین معیار پر
پُورا اُترتا ہے۔ یہ سیمنٹ جلد سے
جلد پائیدار اور کار آمد عمارتیں
تعمیر کرنے کے لئے بے مثل ہے

میپل لیف سیمنٹ فیکٹری۔ داؤد خیل

مغربی پاکستان صنعتی
ترقیاتی کارپوریشن

PRESTIGE

غالب پر فارسی شعرا کا اثر

نریش کمار شاد

اردو کے پرانے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے فارسی شعراء قدیم العہد سے استفادہ نہ کیا ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید ۔۔۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند (حافظ)

سب پہ جس بار نے گرانی کی ۔۔۔ اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا (میرؔ)

تو بخویش چہ کردی کہ بما کنی نظیری ۔۔۔ بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن (نظیری)

مر قو نہیں ہے مطلق جانِ عزیز کا بھی ۔۔۔ اے میر تجھ سے ظالم سے احتراز واجب (میرؔ)

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ۔۔۔ کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا ایں جاست (نظیری)

جس جائے سراپا پہ نظر جاتی ہے اسکے ۔۔۔ آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر (میرؔ)

مسی آلودہ بر لب رنگ پان است ۔۔۔ تماشا کن تہ آتش دخانی است (بیدل)

مسی آلودہ لب پر رنگ پاں ہے ۔۔۔ تماشا ہے تہ آتش دھواں ہے (ناسخ)

بروز بیکسی کس نیست غیر از سایہ یار من

مگر آنہم ندارد طاقت شب ہائے تار من (ناصر علی)

سیہ بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے ۔۔۔ کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے (ناسخ)

کریماں را بدست اندر درم نیست ۔۔۔ خداوندان نعمت را کرم نیست (سعدی)

جو سخی ہیں مال دنیا سے ہیں خالی انکے ہاتھ ۔۔۔ اہل دولت جو ہیں وہ دستِ کرم رکھتے نہیں (انیس)

مرزا غالب تو بنیادی طور پر اپنے آپ کو شاعر ہی فارسی زبان کا سمجھتے تھے۔ اور اُن کے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ان کی فارسی شاعری ہی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی بجا طور پر نمائندگی کرتی ہے۔ ؎

پارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ ۔۔۔ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

لیکن ان کے بعض اردو اشعار بھی دوسرے اردو شاعروں کی طرح فارسی اشعار سے ماخوذ ہیں۔

بوئے گل، نالہ دل، دودِ چراغ محفل ۔۔۔ ہر کہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست (نظیری)

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا (غالب)

نو شدارو ئے محبت رامپرس اجزا کہ چیست سودۂ الماس در زہر ہلاہل مے کنند (فیضی)

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے (غالب)

کبھی کبھی وہ فارسی اشعار کا لفظی ترجمہ کرنیکی بجائے وہ شعر کے بنیادی میلان کو لے لیتے ہیں۔ مثلاً بیدلؔ کا ایک شعر ہے ؎

میروم از خویش و در اندیشۂ باز آمدن ہمچو عمرِ رفتہ یارب بر نہ گردانی مرا

یعنی میں اپنے آپ سے گزرا جاتا ہوں اور ڈر رہا ہوں کہ کہیں پھر اپنے آپ میں نہ آجاؤں۔ اس لئے اے خدا! تو جس طرح میری عمرِ رفتہ کو واپس نہیں لائے گا اسی طرح مجھے بھی اپنے آپ میں واپس نہ لانا۔ غالبؔ نے اس شعر کے مفہوم کو اردو شعر کے قالب میں یوں ظاہر کیا ہے ؎

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

یا راقم مشہدیؔ کا شعر ہے ؎

مے کنُد وعدۂ دیدار بہ فردا امروز یا ندانستہ کہ امروزِ مرا فردا نیست

غالبؔ نے نواب زین العابدین کی موت پر جو غزل بطورِ مرثیہ کہی ہے، اس کا ایک شعر ہے ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے کیا خوب قیامت کا بھی ہوگا کوئی دن اور

مشہدیؔ کے شعر میں "قیامت" اور غالبؔ کے یہاں "امروز" کے الفاظ اگرچہ موجود نہیں لیکن دونوں کی معنوی فضا میں کوئی فرق نہیں۔

غالبؔ اپنے ایسے اشعار میں جن کی تخلیق کے محرک فارسی اشعار ہیں فارسی اشعار کے محض بنیادی میلان ہی کو منتقل نہیں کرتے بلکہ اکثر اوقات شعر کے لطیف و نازک اجزائے معنوی و لفظی مستعار لیکر خود اپنی طرف سے اضافہ کرنے کے بعد شعر کو مکمل کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فارسی اشعار کے مضامین انہوں نے اپنے دل کش اسلوب بیان سے بلند تر کر دیئے ہیں۔ مثلاً فارسی کے کسی مشہور شاعر کا شعر ہے ؎

زضعف تن عجب حال است بیمار محبت را کہ نتوانی کشید از ناتوانی بار صحت را

اس مضمون کو غالبؔ اور غالبؔ کے ہم عصر مومنؔ دونوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ اپنایا ہے۔ مومنؔ کہتے ہیں ؎

اب تو مرجانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

اور غالبؔ کا شعر ہے ؎

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

لیکن غالبؔ اور مومنؔ دونوں نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے، کہ خیال و مضمون کے اتحاد کے باوجود اندازِ بیان اور ترکیب شعری میں فرق ضرور باقی رہے آذری طوسی اسفرائینی کا شعر ہے ؎

جائے کہ داشت کرد فدائے تو آذری شرمندہ از تو گشت کہ جان دگر نداشت

غالبؔ نے اسی بات کو زیادہ سادہ و مؤثر پیرایہ میں یوں کہا ہے ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی! حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دونوں شعروں کا حاصل یہی ہے کہ اگر دوسری جان ہوتی تو اسے بھی نثار کر کے محبت کا حق ادا کرتے۔ نظیریؔ کا شعر ہے ؎

نشاطِ رفتہ ز دوراں بہ صبر بستانم کہ بر معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

اور غالب کہتے ہیں :-　　فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے　　متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض دشمن پر

مرزا کے ایسے تمام اشعار جو اساسی طور پر فارسی اشعار کی پیداوار ہیں، اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہیں کہ مرزا مضمون میں اضافہ کرنے اور مضمون سے مضمون پیدا کرنے کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً عرفی شیرازی کا شعر ہے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ　　ایں ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است

غالب نے مصرعۂ اولیٰ کو معمولی سی ترمیم کے بعد حسنِ خیال کی انتہا کر دی ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عرفی ہی کا ایک اور شعر ہے ؎

کے لازم است بادہ کشیدن ز جام زر　　مقصود تو گر نیست قصور سفال چیست

غالب نے یہی مضمون جب اپنے شعر میں نظم کیا تو اس سے کہیں زیادہ زوردار شعر کہہ دیا ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

اسی طرح عرفی ہی کے اس مطلع سے ؎

بیار بادہ کہ جانم دمے ز نالہ برآید　　ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ برآید

غالب نے اپنے اس سدا بہار شعر کو تخلیق کر لیا ؎

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار　　رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

آصفی شیرازی کا شعر ہے ؎

تو ہم در آئینہ حیراں ز حسن خویشتنی　　زمانہ ایست کہ ہر کس بخود گرفتار است

غالب نے اس مضمون میں اضافہ کرنے کے بعد غم و الم میں زانو کو اپنا مونس بناتے ہوئے کہا ؎

شکوہ سنجِ رشک ہم دیگر نہ رہنا چاہیئے　　میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

دونوں اپنے اپنے حال میں مبتلا ہیں۔ دونوں کا ایک ایک ہمدرد ہے، ایک دوسرے سے کوئی کیا شکوہ کر سکتا ہے، میرا مونس زانو ہے اور تیرا آشنا آئینہ! فریدون خراسانی کا شعر ہے ؎

از ضعفِ دل منال فریدوں ز بیکسی　　میدار دل قوی کہ کسِ بے کساں خداست

غالب کہتے ہیں :-

بیدل نہ ہو بیگانگیٔ خلق سے غالب　　کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

مضمون ایک ہے لیکن غالب نے ضعفِ دل کی بجائے بیگانگیٔ خلق کہہ کر اپنے شعر میں زیادہ وسعت پیدا کر لی۔ ذوقی سمرقندی کا شعر ہے ؎

مکن تغافل ازیں بیشتر کہ می ترسم　　گماں برند کہ ایں بندہ بے خداوند است

لیکن غالب نے محبوب کے تغافل کی بجائے پوری زندگی کی مصیبتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہی بات اس ڈھنگ سے کہی ہے ؎

زندگی اپنی جو اس رنگ سے گزری غالب　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ثبات کہتا ہے ؎　　باآنکہ ہمہ عمر نہ رفتم ز درِ او　　پرسد ز من از ناز ترا خانہ کدام است

غالب کہتا ہے ؎　　لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے　　یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!

شمس تبریز کا شعر ہے ؎

در شرابم چیزے دیگر ریختی — بادہ تنہا نیست ایں آمیختی

غالب نے مصرعۂ ثانی تو وہی رکھا جو شمس تبریز کا ہے لیکن اپنے شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں وہ کیفیت پیدا کر دی جس کی وجہ سے دونوں شعروں میں بڑا پر لطف فرق پیدا ہو گیا ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

فرخی سمرقندی کا مطلع ہے۔

ستارہ ایست دُر گوش آں ہلال ابرو — ز روئے حسن بخورشید می زند پہلو

"می زند پہلو" کا ترجمہ شعر تو کیا نثر میں بھی نہیں ہو سکتا۔ صائب الیاقادر الکلام شاعر بھی اس محاورے کو خوش اسلوبی سے نظم نہیں کر سکا ؎

زند پہلو بہ گردوں کوہ عصیانے کہ من دارم — بصد دریا نہ گرد و پاک دامانے کہ من دارم

لیکن غالب نے اسی مضمون کو موضوعِ "رشک" سے متعلق کرتے ہوئے طالع گوہر فروش تک پہونچ گئے ہیں ؎

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا — کیا اوج پر ستارۂ گوہر شناس ہے

طالب آملی کا شعر ہے ؎

اے گوش از تجسم احوال شدے چو چشم — تا ہر چہ گفتئی از تو مکرر شنیدے

غالب نے اس مضمون میں تصرف کرتے ہوئے جو شعر کہا ہے اس میں مصرعۂ ثانی متحد اور مصرعۂ اولیٰ مختلف ہے۔ طالب کی آرزو ہے کہ میرے کان احول ہوتے جس طرح بعض لوگوں کی آنکھیں احول ہوتی ہیں۔ احول چشم ایک چیز کو دو دیکھتا ہے تاکہ جو کچھ معشوق کہتا، میں دوبارہ سنتا اور لذت سماعت دوبارہ حاصل ہوتی اور مرزا غالب اپنے شعر میں معشوق کی بات کو دوبارہ سننے کے لئے بہرہ بن گئے ہیں۔ اختلاف مذاق کے باوجود دونوں اپنے اپنے معشوق کی ہر بات کو مکرر سننا چاہتے ہیں۔ غالب کا شعر ہے ؎

بہرہ ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب کی شوخئ طبع ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔ اپنی اسی شوخی کی وجہ سے انہوں نے بعض ایسے اشعار جو فارسی شعروں سے اخذ کئے ہیں، زیادہ دلآویز بنا لئے ہیں جیسے ؎

خوش دلم زیں کہ بہ او نامہ نویسم شب و روز — مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نرسد (حسن بیگ رفیع)

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے (غالب)

بہ او چو میرسم آسودہ می شوم از دور — ندیدہ حال مرا وقت بے قراری حیف (فسونی تبریزی)

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق!
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے (غالب)

ہست صد منت بجاں از غیبت بد گو مرا
چوں بایں تقریب من آرد بیاد او مرا (شرف قزوینی)

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے (غالب)

مسئلۂ ارتقاء

پروفیسر عصمت اللہ جاوید

ارتقاء کا تصور کافی قدیم ہے لیکن حیاتیات کے دائرے میں اس اصول کو نباتات و حیوانات پر منطبق کرنے کا سہرا عام خیال کے مطابق ڈارون کے سر ہے کیونکہ چارلس ڈارون نے پہلی بار بتایا کہ اس زمین پر جو مختلف النوع حیوانات پائے جاتے ہیں وہ عمل ارتقا کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اصول ارتقا کو سمجھیں چندان غلط فہمیوں کا ازالہ کر دینا نہایت ضروری ہے جو اس سلسلہ میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ پہلی غلط فہمی تو یہ کہ تصور ارتقاء کا بادا آدم ڈارون تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈارون کی معرکۃ الآرا تصنیف ابتدار الانواع (Origin of Species) نے جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تھی ایک زبردست ہنگامہ برپا کر دیا تھا اور اسکی اشاعت کے بعد ہی ساری سائنسی دنیا نے ارتقاء کے عام اصول کو بے چوں و چرا تسلیم کر لیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تصور ارتقا صرف چارلس ڈارون کے ذہن کی پیداوار ہے اور اس تصور کی بنیاد و ترتیب میں کسی دوسرے کا ہاتھ نہیں تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ نظریۂ ارتقاء کا سراغ ہمیں قبل مسیح بھی ملتا ہے۔ اگر تاریخ فلسفہ میں اس نظریہ کی کھوج لگائی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ افلاطون و ارسطو سے بہت قبل چند یونانی فلسفی یہ نظریہ اپنی ابتدائی شکل میں پیش کر چکے تھے۔ آسبارن کی تصنیف "یونانیوں سے ڈارون تک" کی ورق گردانی سے معلوم ہوگا کہ انیگزیمینڈر (Anaximander) (۶۱۰ — ۵۴۰ ق-م) نے پہلی بار بتایا کہ ابتدا میں ہمارا کرہ دیگر اجرام کی طرح سیال تھا۔ پھر عمل تبخیر کے باعث خشکی نمودار ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ زندگی کی ابتداء پانی میں ہوئی۔ پھر بحری جانور خشکی میں آئے اور اس طرح آگے چل کر خشکی میں زندگی کا آغاز ہوا۔ وہ انسان کو عمل ارتقا کا نتیجہ سمجھتا ہے اور یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اگر ابتدا میں انسان وہی ہوتا جو آج (یعنی اسکے زمانے میں) نظر آرہا ہے تو اس کا درندوں اور بے رحم ماحول کی دستبرد سے بچنا ناممکن ہوتا۔ انیگزاغورث (Anaxagoras) (۵۰۰ — ۴۲۸ ق-م) نے پودوں اور مچھلیوں میں عمل تنفس کا پتہ لگایا اور بتایا کہ انسان پہلے گھٹنوں کے بل چلتا تھا پھر جب وہ عمودی شکل میں صرف پاؤں کے بل چلنے لگا تو اس نے اپنے ہاتھوں سے بھی کام لینا شروع کیا اور اس طرح اپنی عقلی برتری کا ثبوت دیا۔ ہراقلیطس (۵۳۰ — ۴۷۰ ق-م) نے پہلی بار جنگ و جدل اور تصادم کو ہر شئے کا اصل الاصول، قرار دیا اور اس طرح اصول جہد للبقا کی طرف رہنمائی کی ایمپیڈوکلس (Empedocles) (۴۹۵ — ۴۴۴ ق-م) نے تصور ارتقا کو ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کہا کہ اعضاء و جوارح کسی پہلے سے سوچے سمجھے خاکے کا نتیجہ نہیں بلکہ فطرت اعضاء کے ساتھ کئی تجربے اور آزمائشیں کرتی ہے اور نئے اعضا کی تخلیق کرتی ہے، اگر یہ نئے اعضاء ماحول کے تقاضے پورا کرنے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں تو باقی رہتے ہیں ورنہ ناپید ہو جاتے ہیں۔

اسلامی مفکرین میں بھی یہ نظریہ کافی مقبول تھا۔ جاحظ (المتوفی ۸۶۹ء) پہلا شخص ہے جس نے اپنی مایۂ ناز تصنیف "کتاب الحیوان" میں پرندوں میں نقل مکانی کے باعث پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے بعد گیارہویں صدی عیسوی میں ابن مسکویہ (المتوفی ۱۰۳۲ء) نے پہلی بار اسے ایک مستقل نظریہ کی صورت میں اپنی کتاب "الفوز الاصغر" میں پیش کیا۔ مولانا شبلی

نے علم الکلام میں احمد ابن مسکویہ کے نظریۂ ارتقا کا حسب ذیل خلاصہ پیش کیا ہے " موجودات کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ صرف اجسام مفردہ یعنی عناصر موجود تھے۔ عناصر نے جب باہم ترکیب پائی تو سب سے پہلے جمادات وجود میں آئے جو عالم ترکیب کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے۔ جمادات سے ترقی کر کے نباتات کا درجہ آیا۔ نباتات نے بھی درجہ بدرجہ ترقی کی۔ پہلے گھاس وجود میں آئی جو تخم سے نہیں بلکہ آپ سے آپ پیدا ہوتی ہے۔ پھر درخت پیدا ہوئے جس میں تنہ، شاخ، پھل پھول ہوتا ہے ...... ترقی کرتے کرتے ان میں حیوانیت کے خواص پیدا ہوئے اور ان کی سرحد حیوانات کے بالکل قریب ہو گئی مثلاً کھجور اور خرما (کذا) جن میں حیوانات کی طرح نر و مادہ ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ " اپنی پھوپی کھجور کی عزت کرو کیونکہ وہ اسی مٹی سے پیدا ہوئی ہے جو حضرت آدم کی خاک سے بچ رہی تھی۔" نباتات ترقی کرتے کرتے جب حیوانات سے متصل ہو جاتے ہیں تو وہ صنف پیدا ہوتی ہے جو حیوان اور نباتات دونوں کا مجموعہ ہے (جیسے) مونگا سیپ۔" اس کے علاوہ ایک عظیم اسلامی مفکر حسن ابن ہیثم نے جو گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں چمکا تھا مسئلۂ ارتقا کو ایک نظریے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ حسن ابن ہیثم جو یورپ میں الہیزن (Al-Hazen) کے نام سے مشہور ہے۔ اسپین میں پیدا ہوا تھا۔ یہ علم مناظر و مرایا میں مہارت رکھتا تھا اور ماہر ریاضیات بھی تھا۔ اس نے علم المرایا (Optics) کے جو اصول گیارہویں صدی میں دریافت کر لیے تھے ان کی بنیاد پر آگے چل کر گیلیلو نے دوربین ایجاد کی۔ جسٹس امیر علی نے " اسپرٹ آف اسلام" میں اس کے نظریۂ ارتقاء کو مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے:-

" موجودات میں جمادات کا مقام سب سے نیچے ہے۔ اس کے بعد نباتات پھر حیوانات اور سب کے آخر میں انسان کا درجہ ہے انسان باعتبار جسم مادی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور روح کے اعتبار سے اس کا تعلق روحانی اور غیر مادی دنیا سے ہے۔ فرشتے اس سے بھی بلند ہیں (مصنف گوہر مراد نے " فرشتہ" کو فلسفیانہ اصطلاح میں نوامیس فطرت سے تعبیر کیا ہے۔ امیر علی) اور سب سے بلند خدا ہے۔ انسان کی روح مادی قیود سے آزاد ہونے کی مسلسل جد و جہد کرتی ہے اور اس سے آزاد ہو کر بلند ہو جاتی ہے اور خدا سے جا ملتی ہے جہاں سے وہ آئی ہے" اس کے علاوہ ایک اور فارسی تصنیف " چہار مقالہ" ہے جس میں نظامی عروضی سمرقندی نے دیباچہ میں مسئلۂ ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب ۵۵۲ھ مطابق ۱۱۵۵ء میں لکھی گئی اور اس کا سب سے زیادہ مستند نسخہ " اسلامبول" میں ۸۳۵ھ مطابق ۳۲-۱۴۳۱ء میں ضبط تحریر میں لایا گیا۔ اس کے دیباچے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی میں یہ نظریہ اسلامی دانشوروں میں متداول تھا مصنف دیباچہ میں رقمطراز ہے کہ حکمت بالغۂ روزگار اس بات کی متقاضی ہوئی کہ عالم ایک دوسرے سے تسلسل و ترادف کے ساتھ پیوست رہیں۔ اس لئے جمادات میں پہلی چیز جو مٹی تھی ترقی کر کے شریف ترین اور مرجان یعنی بسد میں تبدیل ہو گئی جو عالم جمادات میں بلند ترین مقامات پر (بھی) ہے اور عالم نباتات کی پست ترین چیز سے پیوستہ بھی، عالم نباتات کی پست ترین چیز کانٹا ہے اور بلند ترین چیز کھجور اور انگور جو عالم حیوان سے مشابہ ہیں بدیں معنی کہ اول الذکر کو بارآوری کے لئے نر کی ضرورت ہوتی ہے اور موخر الذکر دشمن سے گریزاں رہتا ہے۔ انگور کی بیل عشقہ سے گریز کرتی ہے عشقہ ایک قسم کی گھاس ہے جو اگر انگور کی بیل سے لپٹ جائے تو اسے خشک کر دیتی ہے اسی لئے انگور کی بیل عشقہ سے بھاگتی ہے) الغرض عالم نباتات میں خرما اور انگور بلند ترین مقام رکھتے ہیں اس لحاظ سے کہ اپنے سے بلند عالم سے مشابہت رکھتے ہیں اور نہایت حسن و خوبی سے اپنی دنیا سے باہر قدم رکھتے ہیں اور ارتقا کی بلند سمت میں گامزن ہیں۔ جب یہ دنیا پایۂ تکمیل کو پہنچی تو ایک اعلیٰ فرزند کی تخلیق ہوئی اور عالم حیوان ظہور پذیر ہوا۔ ہر حیوان جس میں قوت مدرکہ اور قوت محرکہ اور ان کی دس شاخیں[1] ہوتی ہیں اسے

---

[1] مراد حواس عشرہ۔ بقول مصنف چہار مقالہ ظاہری حواس خمسہ (باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ) کے علاوہ باطنی حواس خمسہ یہ ہیں (۱) حس مشترک (۲) خیال (۳) (حیوان میں) قوت متخیلہ یا (انسان میں) قوت متفکرہ (۴) وہم (۵) قوت حافظ یا ذاکرہ۔

حیوان کامل کہتے ہیں۔ ان میں سے کوئی شئے جس حیوان میں جتنی کم ہوگی وہ اتنا ہی ناقص کہلائے گا۔ جیسے چیونٹی جس کی آنکھیں نہیں ہوتیں اور سانپ جس کے کان نہیں ہوتے اور جو "مارگر" (بہرا سانپ) کہلاتا ہے۔ عالم حیواں میں خراطین ناقص ترین ہے۔ خراطین ایک سُرخ کیڑا ہے جو آبجو کی مٹی (یعنی تہہ) میں ملتا ہے اور اسے گل خوارہ (مٹی کھانے والا) کہتے ہیں۔ عالم حیوان میں وہ پست ترین ہے اور بلند ترین نسناس۔ یہ ایک حیوان ہے جو ترکستان میں پایا جاتا ہے جو منتصب القامت، راست قد اور چوڑے ناخنوں والا ہوتا ہے اور آدمی سے گہرا لگاؤ رکھتا ہے۔ جب بھی وہ کسی آدمی کو پاتا ہے راستہ میں رک کر اسے دیکھنے لگتا ہے اور اگر کوئی اکا دکا آدمی مل جائے تو اسے اُٹھالے جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے "بارآور" ہوتا ہے۔ الغرض باستثنائے انسان وہ حیوانات میں بلند ترین ہے اس لئے کہ وہ انسان سے مندرجہ ذیل باتوں میں مشابہ ہے یعنی اول تو راست قد ہے دوم چوڑے ناخن رکھتا ہے اور سوم اس کے سر پر بال ہوتے ہیں[1] ...... آگے چل کر جب کئی طویل دور بیتے اور کافی زمانہ گزر گیا تو مزاج (آفرینش) میں مزید لطافت پیدا ہوئی اور جب عناصر وا فلاک میں خلا پیدا ہونے کا وقت آیا تو انسان عالم وجود میں آیا اور اپنے ساتھ وہ سب کچھ لایا جو عالم جمادات و نباتات و حیوانات میں تھا اور اس پر معقولات کی تفہیم کا اضافہ کیا۔ پھر عقل کی مدد سے حیوانات کا بادشاہ بن گیا اور سبھوں کو اپنے تصرف میں لایا۔"

مولانا روم (۱۲۰۷ء تا ۱۲۷۳ء) کے زمانے تک یہ نظریہ اگر عوام میں نہیں تو دانشوروں میں مقبول ہو چکا تھا چنانچہ مولانا نے بھی نظریۂ ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔ بعض حضرات اسے مولانا کے "مکاشفات" میں شامل کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ بہرحال ان کے وہ اشعار بھی سن لیجئے جن میں انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے:۔

آمدہ اول بہ اقلیم جماد — وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد نادرد از نبرد
وز نباتی چوں بحیواں افتاد — نامدش حال نباتی ہیچ یاد
باز از حیواں سوئے انسانیش — می کشد آں خالقے کہ دانیش
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تاشد اکنوں عاقل و دانا و زفت

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

"از جمادی مُردم و نامی شدم — وز نما مُردم بحیواں سرزدم
مُردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کے زمردن کم شوم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر — تا برآرم از ملائک بال و پر
بار دیگر از ملک پراں شوم — آنچہ اندر وہم نایدآں شوم"

اس سلسلہ میں اسلام اور نظریۂ ارتقاء سے متعلق حضرت نیاز فتحپوری کے خیالات فکر انگیز ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالہ[2] موسوم بہ "مذاہب عالم میں اسلام کا مرتبہ" میں "مذہب کا مستقبل" کی ذیلی سُرخی کے تحت اسلام اور تصور ارتقاء میں مندرجۂ ذیل الفاظ میں

---

[1] اس سے گمشدہ کڑی (Missing link) پر روشنی پڑتی ہے۔ میرے قریبی دوست خیال کہ پوری بتاتے ہیں کہ ماجستان میں اس قسم کے جانور کے متعلق کئی قصے زبان زد خاص و عام ہیں۔

[2] نگار سالنامہ جنوری ۱۹۵۹ء تبلیغ اسلام نمبر ص ۳۱-۳۰

تطابق پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "سب سے زیادہ صدمہ مذاہب کو جس چیز سے پہنچا ہے وہ ڈاروِن کا اصولِ ارتقا (Evolution) تھا لیکن اسلام اس لحاظ سے بھی تمام مذاہب سے ممتاز نظر آتا ہے .... قرآن میں خود اس مسئلہ کے مختلف مدارج و اصول کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے (۱) ربنا الذی اعطیٰ کل شیٔ خلقہ، ثم ہدیٰ (ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی فطرت و جبلت عطا کی اور پھر ترقی کی طرف مائل کیا) کیا ڈاروِن کے اصول انواع کا اس کے سوا کوئی اور مفہوم ہے؟ (۲) لیس للانسان الا ما سعیٰ رفع بعضکم فوق درجات۔ کیا تنازع البقا اور صلاحیت کے لحاظ سے مختلف درجات کے قیام کی تعیین اور بقاءِ اصلح کو ان سے بہتر الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے؟ ..... (۳) ھو الذی انشاٴکم من نفس واحدۃ فمستقر و مستودع۔

کیا موجودہ علم الحیات کا یہ مسئلہ کہ آفرینش کا یہ سلسلہ صرف ایک نفس سے ہوا ہے جسے (Protein) کہتے ہیں کوئی دوسری چیز ہے؟ کیا لفظ مستقر سلسلۂ آفرینش کے مختلف مدارج کو ظاہر نہیں کرتا؟ اور کیا لفظ مستودع سے سلسلۂ آفرینش کی آخری مکمل کڑی (انسان) کی طرف اشارہ نہیں ہے؟"

غرض کہ اسلامی مفکرین کے لئے ارتقار کا تصور نیا نہیں تھا اور نہ اس نظریے کے ماننے میں ان کے خیال میں قرآن مانع تھا۔

اب ڈاروِن کے قریبی زمانے کے یورپ کی طرف آئیے۔ جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کا نام آپ نے سُنا ہوگا وہ فلسفی بننے سے پہلے ایک ماہر ریاضیات اور سائنس داں تھا۔ اس نے ۱۷۵۵ء میں اپنی سائنٹفی تصنیف "قدرت کی عام تاریخ اور نظریہ افلاک" شائع کی جس میں اس نے وضاحت سے بتایا ہے کہ موجودہ ذی حیات دنیا ایک طویل تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اس نے ارتقار کو انتخاب، توافقِ ماحول اور توارث کے ضروری عوامل کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس نے اپنی مایۂ ناز تصنیف "فکرِ مطلق کا تنقیدی تجزیہ" (مطبوعہ ۱۷۹۰ء) میں بھی اسی نظریہ کی مزید وضاحت کی ہے گو کہ اس نے اصول علیت طبیعی (Natural causation) کو شعوری ملتہائے غائی کے اصول سے خلط ملط کر کے اسے غائیت (teleology) کے تابع قرار دیا ہے لیکن اس کتاب کا وہ حصہ جس میں اصول ارتقار کا نظریہ پیش کیا گیا ہے اپنے تصور کے "جدید پن" کے لحاظ سے کافی دلچسپ ہے۔ پروفیسر رچرڈ البرٹ ولسن لکھتے ہیں "یہ بہت ممکن ہے کہ ڈاروِن نے اپنے نظریے کی بنیاد اس کتاب میں مندرجہ نظریہ پر رکھی ہو۔" اس سلسلے میں گوئٹے کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ گوئٹے ایک فلسفی اور شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ لیکن وہ معدنیات، نباتات، علم الارض، علم تشریح الابدان، علم استخواں (osteology) اور علم کالبد شناسی (Anatomy) میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ وہ بھی نظریہ ارتقار کا شدومد سے قائل تھا۔ پروفیسر آسبارن نے اسے "عظیم ترین شاعر ارتقا" کا خطاب دیا ہے۔ اس کی مشہور عالم تصنیف فاوسٹ (مطبوعہ ۱۸۰۸ء) میں روحِ ارضی کے گیت میں اسی تصور کا پرتو ملتا ہے۔

اب تک انھیں لوگوں کا ذکر ہوا جو ماہرین حیاتیات نہیں تھے۔ حیاتیات کے میدان میں بھی ہمیں ڈاروِن کا ایک پیشرو ملتا ہے ۱۸۰۹ء میں لیمارک نے "فلسفۂ حیوانیات" نامی کتاب شائع کی جس میں اس نے اصول ارتقار کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا نظریہ ڈاروِن کے نظریہ سے مختلف ہے لیکن شعبہ حیاتیات میں ان اصول کو منطبق کرنے کے سلسلے میں فضل تقدم کا مستحق ڈاروِن کے بجائے لیمارک ٹھہرتا ہے۔ ماہرین حیاتیات کا ایک گروہ آج بھی لیمارک کا پیرو ہے۔ ہربرٹ اسپینسر کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاروِن کے ہمعصر ہربرٹ اسپنسر نے بھی ارتقار پر کئی جلدوں میں کتابیں لکھی ہیں۔ ڈاروِن کی "ابتدا والانواع" سے سات سال قبل اس نے ۱۸۵۲ء میں (Development Hypothesis) (نظریہ نشوونما) شائع کی جس میں اس نے پہلی بار "بقاءِ اصلح" کی اصطلاح وضع کی اور معاشرتی ارتقا کا تصور پیش کیا۔ اس نے اس اصول کو نہ صرف حیاتیات (اصول حیاتیات مطبوعہ ۱۸۶۳ء) پر

منطبق کیا ہے بلکہ اس عمل کی کارفرمائی اسے نفسیات (اصول نفسیات مطبوعہ ۱۸۵۵ء) عمرانیات (کئی جلدوں میں) اُخلاقیات (اصول اخلاقیات مطبوعہ ۱۸۹۳ء) میں بھی نظر آئی ہے۔ "ترقی" نامی مقالے کے فٹ نوٹ میں اسپنسر نے اس بات کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ اس نے اپنے نظریۂ ارتقاء کی بنیاد لیمارک کے نظریہ پر رکھی ہے اور یہ کہ وہ اس معاملہ میں ڈارون کا نہ تو پیشرو ہے اور نہ پیرو۔

خود ڈارون کے زمانے میں ایک اور شخص ڈارون ہی کے خطوط پر کام کر رہا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ ۱۸۴۲ء میں چارلس ڈارون نے نظریۂ انتخاب طبیعی پر ۳۵ صفحات پر مشتمل اپنا مقالہ تیار کیا تھا۔ دو سال کے بعد اس نے اپنے نئے تجربات کی روشنی میں اس مسودہ میں ایزاد کر کے اُسے دو سو تیس صفحات پر پھیلا دیا۔ ۱۸۵۶ء میں اس کے ایک ماہر ارضیات دوست لیئل نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے نتائج فکر کو شائع کر دے۔ ڈارون اپنے مسودہ کی نوک پلک درست کرنے میں مشغول تھا کہ اسے ریاست ہائے ملایا سے ایک خط ملا۔ یہ خط الفریڈ رسل ویلیس (Wallace) نے لکھا تھا جس میں اس نے اپنے نظریہ ارتقا کے وہی اصول پیش کئے تھے جنکی بنیاد پر ڈارون کام کر رہا تھا۔ یہ حیرت انگیز توارد دیکھ کر ڈارون کافی پریشان ہوا۔ گو کہ ویلیس نے اپنے مقالہ کی اشاعت کے بارے میں ڈارون کو کچھ نہیں لکھا تھا۔ لیکن پھر بھی ڈارون نے سوچا کہ ایسی صورت میں جب کہ یہ بات علم میں آچکی ہے صرف اپنا مقالہ شائع کرانا ایک قسم کی بددیانتی ہے۔ اس نے اس سلسلے میں اپنے دوست لیئل اور ہوکر سے مشورہ طلب کیا۔ انھوں نے یہ رائے دی کہ اس گتھی کو سلجھانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دونوں کے نظریے بیک وقت منظر عام پر آئیں۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں ویلیس اور ڈارون دونوں کے مقالے پڑھ کر سنائے گئے۔ اس واقعہ کے دو سال بعد ڈارون کی کتاب "ابتداء الانواع" ۲۴ر نومبر ۱۸۵۹ء کو زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت نے کیا کیا تہلکہ مچایا اس کا ذکر خارج از موضوع ہے۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ڈارون کے ساتھ ساتھ ہمیں ویلیس کا بھی نام ضرور لینا چاہئے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر ہمیں بہر حال یہ ماننا پڑے گا کہ اس نظریہ کی عام مقبولیت کا سہرا ڈارون اور صرف ڈارون ہی کے سر ہے۔

دوسری عام غلط فہمی جس کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ڈارون نے انسان کو بندر کی اولاد کہا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ نہ تو "ابتداء الانواع" میں اور نہ "نژاد آدم" (Descent of Man) مطبوعہ ۱۸۷۱ء میں ڈارون نے کہیں یہ کہا ہے کہ انسان ایک "ترقی یافتہ میمون" ہے۔ اس نے تو صرف اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ لیمور (شب رو بندر جو مدغاسکر میں پایا جاتا ہے) میمون (Ape) بن مانس (Baboon) گوریلا، شمپانزی اور انسان یہ سب کے سب ایک "ترتیب" (اعلیٰ ذوات الثدی حیوانات) کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔ یعنی بوزنہ ترقی کر کے انسان نہیں بنا بلکہ یہ تمام انواع ہرائیٹ سے نکلی ہیں بالفاظ دیگر لیمور میمون وغیرہم اور انسان کے آبا و اجداد ایک تھے۔ اس سے یہ مطلب نکالنا کہ آج کا انسان کل کا بندر تھا یا یہ کہ آج کا بندر آگے چلکر انسان بن جائے گا۔ قطعی غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ نتیجہ نکالنا بھی ایک دوسری غلط فہمی کی وجہ سے ہے اور وہ یہ کہ عام طور پر ارتقا کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ حیات کے مختلف النوع مظاہر ایک نردبان کی شکل میں ترقی کر کے اپنی شکلیں بدلتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان اور بندر کے آبا و اجداد ایک تھے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بندر میں انسان بننے کی صلاحیت یقینی طور پر موجود ہے، ایک غلط فہمی اور بھی ہے اور وہ یہ کہ عام طور پر ارتقا سے صرف ترقی مراد لی جاتی ہے لیکن یہ تصور جدید تحقیقات کی روشنی میں درست نہیں، اس لئے کہ ارتقا میں ترقی ثانوی حیثیت رکھتی ہے نہ کہ مقصدی، ارتقا ایک خاص قسم کی تبدیلی کا نام ہے اور تبدیلی مثبت بھی ہو سکتی ہے اور منفی بھی۔ اس کا ذکر آگے چل کر مناسب جگہ کیا جائے گا۔

(باقی)

اردو غزل

یوگیندر پال صابر ایم۔ اے

پچھلے تیس سال میں غزل پر اچھا بُرا، اسکی موافقت اور مخالفت میں اتنا لکھا جاچکا ہے کہ اب بظاہر اس پر کچھ اور لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مگر غزل کے حسن کی طرح اس کے ذکر کا حسن بھی کبھی ختم نہیں ہوتا۔

بڑی وسعت ہے میری داستاں میں　　بنا ہے لیجے جب نام ان کا

تاریخ و فلسفہ کے ادوار کی طرح فن کا ہر دور بھی اپنے میں مکمل و آزاد ہوتے ہوئے ساتھ ساتھ اپنے سے پہلے کے تمام ادوار سے مربوط و متعلق ہوتا ہے۔ اور انسے الگ ہو کر وہ نہ صرف نامکمل ہو جاتا ہے بلکہ بے معنی بھی۔ غزل بھی ایک فن ہے۔ موجودہ غزل کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ بھی سمجھا جائے کہ غزل کن کن منزلوں سے گزر کر یہاں تک آئی ہے اور غزل کے ناز و غمزہ کس طرح "دشنہ و خنجر" بنے ہیں۔

اردو بولنے اور لکھنے پڑھنے والوں کی زندگی میں اردو شاعری اور خاص طور سے غزل اور اسکی تہذیب اس درجہ گھل مل گئی ہے کہ لوگ اب یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہ زبان اور تہذیب کہاں سے ہم تک پہنچی ہے۔ اردو غزل کا سلسلہ ابتدائی ہندی۔ بھاشا، پراکرت سے چلکر فارسی اور پھر عربی تک پہنچتا ہے۔ عرب سے ہندوستان کو شاید کوئی چیز بھی اپنی اصلی عربی شکل میں نہیں آئی۔ ہر چیز فارس ہو کر آئی ہے اور اس لئے ہر چیز پر فارسی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اردو غزل بھی اسی قسم کی چیز ہے پچھلے پندرہ سولہ سال سے اردو ہندوستان و پاکستان کے سیاسی حالات کی زد میں ہے۔ اور ان حالات کی وجہ سے اردو کی جو حالت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو بڑی بدنصیب و مظلوم زبان ہے۔ بات سچ بھی ہے۔ مگر اردو کی ادبی تاریخ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا۔ کہ اردو دنیا کی خوش نصیب ترین زبانوں میں سے ہے۔ جو لوگ اردو کی تاریخ سے واقف ہیں۔ انھیں اس بات پر حیرت نہیں ہوتی کہ اس زبان نے اتنے کم وقت میں اس درجہ ترقی کیسے کرلی۔ اردو کو اتنے بڑے بڑے خزانے بطور نذرانہ ملے ہیں۔ کہ اسے اپنی تنگیٔ داماں کا شکوہ تک کرنا پڑا ہے۔ اردو کے تمام اصناف سخن فارسی سے آئے ہیں۔ اور غزل بھی اسی مال غنیمت میں آئی ہے۔ غزل کی شکل و صورت، عروض، بحور، ردیف و قافیہ کے اصول، تشبیہات و استعارات، اشارات و تلمیحات ہر چیز فارسی میں سے اردو میں منتقل ہو گئی۔

اردو غزل کی زبان میں یہ نزاکت، یہ نازک مزاجی اور یہ بال کی کھال نکالنے کی عادت فارسی ہی سے آئی ہے۔ عام طور پر زبانوں کو اپنے نوک پلک درست کرنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ اردو کی بالکل ابتدائی شاعری میں تو ہندی اور بھاشا کا رس جس کچھ کچھ ملتا ہے۔ مگر اس کے بعد کی شاعری میں تو اردو غزل قطعی فارسی غزل کی دوسری صورت نظر آتی ہے۔ جو لوگ اردو شاعری کو ذرا دور سے جانتے ہیں۔ وہ اردو شاعری کے معنے اردو غزل سمجھتے ہیں۔ اردو والے اگر ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں تو یہ بات کچھ زیادہ غلط بھی نہیں ہے۔ یوں اردو میں مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی سب کچھ ہے۔ مگر ہندوستان کے عوام کو ان سے کیا واسطہ، قصیدہ خالص درباری شاعری ہے۔ مرثیہ کی حیثیت نیم مذہبی قسم کی رہی ہے۔ اب لے دیکے غزل ہی رہ جاتی ہے۔ جو عوام تک پہونچتی ہے۔ پھر ان کا غزل کو اردو شاعری اور اردو شاعری کو غزل سمجھنا کیا غلط ہے۔ اور جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اردو غزل ایک مدت تک ہندوستان میں رہ کر بھی فارسی ہوا ہی میں سانس لیتی رہی ہے۔ ہندی اور اردو کی لڑائی اصل میں رسم الخط یا چند الفاظ کی لڑائی نہیں ہے یہ دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے۔

غزل کے معنے عورتوں سے باتیں کرنا بھلے ہو مگر اردو کے بڑے شاعروں نے غزل کو کبھی چھوٹی چیز نہیں بننے دیا۔ رہی عشقیہ شاعری تو میرا عقیدہ ہے کہ دنیا کی عظیم ترین شاعری میں عشقیہ شاعری کو بھی دوسری اقسام شاعری کے برابر مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ یہاں یہ سچ ہے کہ عشقیہ شاعری نہایت ذلیل شاعری بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ عشقیہ شاعری ہی پر کیا موقوف ہے۔ دنیا کی کسی چیز کو خراب نہیں کہا جا سکتا۔ میں اسے بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اردو میں گھٹیا درجہ کی عشقیہ شاعری بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور گھٹیا درجہ کے شاعروں نے غزل اور عشقیہ شاعری کو جی بھر کے رسوا کیا ہے۔ دنیا کی عظیم حقیقتوں پر چھوٹے درجہ کے لوگ ہمیشہ سے ظلم کرتے آئے ہیں۔ مگر یہ حقیقتیں مظلوم ہو کر بھی اپنا تقدس باقی رکھتی ہیں۔

میر غزل کے بڑے شاعر ہیں۔ انکی عشقیہ شاعری لذت و طلب وصال سے زیادہ درد مہجوری کی داستان ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انکی عشقیہ شاعری اتنی مہذب ہے۔ غالب اور ان کے بعد اقبال نے اردو غزل کو اس مقام پر پہنچا دیا۔ جہاں فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا۔ اقبال کی جن غزلوں میں غزل کو معراج ہو گئی ہے وہ ان کے دوسرے اور تیسرے دور کے کلام میں ہیں۔ پہلے دور کی غزلیں جو بانگ درا میں موجود ہیں۔ کچھ خاص قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ ان میں زیادہ تر بس رسمی اور روایتی غزلیں ہیں جو انہوں نے غالباً داغ کے زیر اثر لکھی ہیں۔ وہ زمانہ ہی داغ کا تھا۔ آج بھی اردو غزل گو شعراء میں بہت سے شاعر ہیں۔ جو داغ کے کلام کو اپنی منزلِ مقصود سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ عظیم شاعری کیا ہوتی ہے اور بڑا شاعر کسے کہتے ہیں۔

؎ اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

داغ اور انکے اسکول کے شعراء نے اردو کی جو خدمت کی اسے زیادہ تر لوگ جانتے ہیں۔ مگر انہوں نے اردو پر جو ظلم کیا ہے۔ اسے کم لوگ ہی جانتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ داغ نے غزل کی زبان کو مانجھا اور صاف کیا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ داغ نے اردو شاعری کو عالموں اور فاضلوں کی انجمن سے اٹھا کر طوائفوں اور قوالوں کی محفل میں بٹھا دیا۔ اردو اس زہر کے اثر سے اب تک فارغ نہیں ہے۔ آج شاعروں کی جو علمی و ادبی حیثیت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اور ان میں جو بے پڑھے لکھے جاہل اور گویئے قسم کے شاعر چھائے ہوئے ہیں۔ وہ اسی زہر کے اثرات میں سے ایک ہے۔ وہ تو یہ کہیئے کہ خدا کو اردو کی آبرو رکھنی منظور تھی۔ جو اسی زمانہ میں حالی پیدا ہو گئے، حالی نے اس غیر سنجیدہ اور غیر شریفانہ فضا میں سنجیدگی، شرافت اور سادگی کی دعوت دی۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ حالی کو کتنی سخت اور ہمت شکن مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا ہوگا۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو حالی کے حصۂ نظم کو اقبال کے پورے کلام کو شاعری ہی نہیں مانتے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھا آدمی یہ کہے کہ میں مانتا ہی نہیں کہ سورج نام کی کوئی چیز اس کائنات میں ہے۔ عوام کے ذوق کی تسکین کر کے انھیں خوش کرنا بہت آسان اور کافی کارآمد ہے مگر ان کی بہبودی کی کوئی بات عوام سے منوا لینا تو دور انکے سامنے کہنا بھی خطرہ سے خالی نہیں۔ سقراط کو زہر، حضرت عیسٰی مسیح کو صلیب، حضرت محمد عربی کو پتھر اور سخت قسم کی تکالیف، ابراہیم لنکن اور مہاتما گاندھی کو بندوق کی گولی عوام کی طرف سے اسی قسم کی خدمات کے بدلے ملتی رہی ہیں۔ طوائفوں کی غزل خوانی کے بیچ میں بیوہ کی مناجات سنا کر حالی نے بھی کچھ اسی انداز کا کام کیا تھا۔ اقبال کے بعد غزل کے جو بڑے شعراء ہوئے ہیں۔ ان میں اصغر۔ فانی۔ حسرت۔ اور جگر کا انتقال ہو چکا ہے جو حضرات ابھی موجود ہیں ان میں فراق گورکھپوری نئے اور پرانے رنگِ تغزل کا سنگم ہیں۔ جذبی اور فیض بالکل نئے رنگ کے شاعر ہیں۔ لکھنؤ اسکول کے ممتاز شعراء میں اثر لکھنوی، آنند نرائن مُلا اور سراج لکھنوی ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ اور بھی بہت سے نہایت ہونہار شاعر ہیں مگر وہ ابھی رہگزر میں ہیں۔ ان کے بارے میں اس وقت کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

اصغر کو عام طور پر لوگ تصوف کا شاعر سمجھتے ہیں۔ میں کبھی اس بات سے پوری طرح اتفاق نہ کر سکا۔ اصغر اصل میں حسن کے شاعر ہیں، عشق کے نہیں۔ یہ خیال رکھیئے۔ یہاں حسن کا ذکر وہ کچھ ایسے لب و لہجہ سے کرتے ہیں۔ کہ اس پر تصوف کا دھوکا ہوتا ہے۔ انھوں نے خود کئی جگہ یہ اعلان کیا ہے۔ کہ ان کے کلام میں فریاد و ماتم کی گنجائش نہیں ہے۔ غم بذاتِ خود کوئی بہت اچھی چیز نہیں۔ مگر غم کی نرم آنچ سے زندگی اور شاعری میں جو حسن اور گداز پیدا ہوتا ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ فانی کو یاسیات کا امام کہا جاتا ہے۔ اور درست کہا جاتا ہے۔ فانی غم و یاس کے شاعر ہیں۔ میر بھی غم کے شاعر ہیں مگر میر کا غم غمِ عشق ہے۔ جو زندگی کو کچھ سہارا بھی دیتا ہے۔ فانی کے یہاں تو زندگی ہی غم ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ہی نہیں جو غم نہیں۔ اس قسم کا غم بڑا بھیانک ہوتا ہے یہ آدمی سے زندہ رہنے

کا حوصلہ چھین لیتا ہے۔ اس پر سوچتے چلے جائیے تو سلسلہ خودکشی پر جاکر ختم ہوگا۔ اگر کسی آدمی کی زندگی مجسم غم ہوگئی ہو تو اس پر رحم کیا جاسکتا ہے لیکن اس قسم کی شاعری سخت قسم کا سماجی جرم ہے۔

جس سے چمن اُفسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

لیکن جہاں فانی کے غم کی شدت کم ہوگئی ہے۔ اور انھیں زندگی کے حسن کا بھی کچھ احساس ہوا ہے وہاں فانی کے قلم نے ایسے جواہر پارے بھی تراشے ہیں جن کی مثال ہمیں اس دور کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں مل سکتی۔ فانی کے بارے میں دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کا کلام فنی اعتبار سے نہایت سجا سنورا ہوا ہے۔ انہیں فن اور زبان و بیان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔ اپنے محدود دائرہ میں فانی کا کلام بڑی گہرائیاں رکھتا ہے۔

حسرت موہانی کو اگر میں اس دور کا سب سے بڑا غزل گو شاعر کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ انکی عشقیہ شاعری صحیح معنی میں نہایت صحت مند اور ہمت افزا ہے۔ اس میں زندگی کا حسن اور حسن کی زندگی کے ساتھ ساتھ عشق کی مہذب شوخیاں بھی موجود ہیں۔ انکی عاشقانہ شاعری کا سب سے بڑا حسن یہ ہے کہ ان کے عشق کا تصور خالص زمینی نہیں بلکہ خانگی ہے۔ عشق کی اس تصویر میں بڑی تہذیب اور شرافت ہے۔ اردو غزل میں جس عشق کا ذکر ہوتا ہے وہ ہمیشہ سے بڑا خانہ خراب قسم کا جذبہ ہے حسرت کی غزلوں میں اردو غزل کے لئے حیات ولقا کا پیغام ہے۔

جگر مرادآبادی اس دور کے شاید سب سے زیادہ مشہور غزل گو شاعر تھے۔ انکی شہرت کی وجہ انکی شاعری سے زیادہ انکی شخصیت تھی۔ انکے کلام کا پورا حسن تو مشاعروں ہی میں ظاہر ہوتا تھا۔ کتابوں میں تو وہ حسن آدھا بھی نظر نہیں آتا۔ جگر کا کلام ایک ذہین، شریف، اور کم پڑھے لکھے آدمی کا کلام ہے۔

فراق گورکھپوری آج کی دنیائے شاعری کا سب سے بڑا معمہ ہیں۔ فراق صاحب کو خود اور ملک کے کئی نقادوں کو اس بات کا یقین ہے کہ فراق حال سے زیادہ مستقبل کے شاعر ہیں، خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ فراق کی غزلوں اور نظموں کا زیادہ تر حصہ مجھے بیحد پسند ہے۔ مگر کچھ ایسے شعر بھی دیکھے ہیں جن کے بارے میں کوئی رائے قائم ہی نہیں کر سکا۔ زبان کے معاملہ میں ان کے کچھ تجربات جو اپنی حد کے اندر ہیں کامیاب ہیں۔ مگر بعض تجربات ایسے بھی ہیں جن کی کامیابی کا مجھے یقین نہیں ہوتا۔

مولانا حسرت نے اپنے انتخاب میں مختلف عنوانات قائم کئے ہیں۔ مثلاً عاشقانہ، باغیانہ وغیرہ۔ پوری غزل کا اس درجہ ایک ہی رنگ و مضمون کا ہونا کہ اسے کسی خاص عنوان سے پکارا جاسکے غزل کو نظم کے بہت نزدیک کر دیتا ہے۔ اردو میں مسلسل غزل پرانی چیز ہے مگر یہ عنوان غزل کے لئے ایک نئی اور اچھی بات ہے۔ مگر یہ قانون نہیں بن سکتی۔ اگر غزل کے تمام اشعار کے مضامین ایک دوسرے سے مختلف ہوں پھر بھی اسکے غزل ہونے میں کوئی خلل نہیں آتا۔ غزل کے شعروں میں مضمون کا تسلسل تلاش کرنا مغرب زدگی کا پیدا کیا ہوا بے تکا پن ہے۔ غزل کے بہترین و بلند ترین اشعار وہی ہیں۔ جنہیں کسی خاص عنوان کے تحت نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ تو صرف شعر ہیں؛ اور ان کا سب سے بڑا حسن ان کی شعریت اور تاثیر ہے۔ جہاں تک غزل کی شکل و صورت کا تعلق ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ممکن ہے اور نہ کسی شاعر نے اس کی کوشش کی۔ مگر مضمون کے اعتبار سے نئی غزل پرانی غزل سے بہت مختلف ہے۔ نئی غزل میں غزل کے پرانے سمبلز Symbols مثلاً برق و نشیمن، شمع و محفل، ساقی و شراب کا نیا اور خلاقانہ استعمال ہو رہا ہے۔

ان دروازوں سے غزل میں سیاسی اور سماجی مسائل داخل ہوئے ہیں۔ یہ بات غزل کے لئے نہایت مفید اور صحت افزا ہے مگر یہ نہ بھولئے کہ بنیادی طریقے سے غزل اب بھی غزل ہی ہے۔ ہمیشہ کی طرح کاروبارِ دلداری اور وارداتِ قلب و جگر آج بھی غزل کا محبوب ترین موضوع ہے۔ غزل کی زبان اصل میں ناز و نیاز اور حسن و عشق کے معاملات کی زبان ہے۔ یہ زبان نہیں بدل سکتی اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی جو سیاسی یا سماجی مسائل دربارِ غزل میں آتے ہیں۔ وہ غزل کے عطا کئے ہوئے لباس ہی میں آتے ہیں۔ ان مضامین کا یہ لباس ہی جادو جگاتا ہے۔ دوسری بات غزل کی عشقیہ شاعری کی ہے۔ سلیقہ سے کی ہوئی عشقیہ شاعری ہر قسم کی شاعری سے زیادہ روح و دل کے نزدیک جاتی ہے۔ سنسکرت اور ہندی میں شعر نگار اس کو رس راج کہتے ہیں۔ اور ہر ادب میں عشقیہ شاعری بلند ترین شاعری میں شمار ہوتی ہے۔

بعض لوگ سماج پر ایک بم کی طرح پھٹتے ہیں اور درختوں کی جڑیں اکھاڑ دینے والے اور مکانوں کی چھتیں اڑا دینے والے طوفان کی طرح آتے ہیں۔ مثلاً حکمرانوں میں ہٹلر اور شاعروں میں جوش ملیح آبادی۔ ایسے لوگوں کو بھتے تو جرگم لوگ ہی ہیں۔ مگر انھیں دیکھ کر سہم جاتے ہیں۔ مگر یہ بم اور طوفان سے پیدا ہونے والے حالات زیادہ دیر ٹھہرتے نہیں۔ تھوڑی دیر میں فضا میں پھر سکون اور افق صاف ہو جاتا ہے۔ اور دنیا انھیں بھول جاتی ہے۔ یہ پرسکون فضا اور صاف افق دنیا کی اصلی حالت ہے جو خود بھی دیرپا ہے اور جس کا اثر بھی دیرپا۔ آزادی سے پہلے ہندوستان کے ماحول کو ذہن میں رکھتے ہوئے جوش ملیح آبادی کے کلام کی اٹھائی ہوئی قیامتوں کو سوچیے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب اردو میں جوش کے علاوہ کوئی شاعر ہے ہی نہیں۔ ان دنوں میں انٹر یا بی اے کا طالبعلم تھا۔ ادب کا مطالعہ تو بہت کر چکا تھا۔ مگر ہضم بہت کم حصہ ہی کر سکا تھا۔ میں خود جوش کو اقبال سے بھی بڑا شاعر مانتا تھا۔ لیکن آج کے حالات دیکھیے دنیا کے کمزور حافظے سے جوش کا نام قریب قریب گم سا ہو گیا ہے۔ یہ کہنا کہ اسکی وجہ جوش کا پاکستان چلا جانا ہے۔ درست نہیں ہے۔ جوش کا کلام تو اب بھی ہندوستان میں موجود ہے۔ اب اسکی وہ طوفانی تاثیر کہاں چلی گئی۔ اصل میں بات کچھ اور ہے۔ فن میں پختگی فکر و احساس کی نرم آنچ سے آتی ہے۔ کوہ آتش فشاں کی آگ میں ابال تو ہوتا ہے ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔ جوش کے سیاسی کلام میں وہی آتش فشاں پہاڑ کا ابال تھا جو وقت کے ساتھ ختم ہو گیا۔

آج کے ترقی پسند اور انگریزی داں طبقہ میں لفظ فن کے معنی کچھ بدل سے گئے ہیں۔ آج کل فن کے معنی عروض، بحر و وزن، ردیف و قافیہ اور زبان و بیان سے زیادہ مفہوم شعر اور مقصدِ شعر کو سمجھا جاتا ہے۔ پرانے لوگ بھی مفہوم سے بے نیاز تو نہ تھے مگر فن کے معاملہ میں زیادہ تر زور الفاظ شعر پر ہی دیتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آجکل اردو کے بعض چوٹی کے نقاد کسی شاعر پر نقد و تبصرہ کرتے وقت تمام تر توجہ مفہوم و مقصد کلام پر صرف کر دیتے ہیں۔ معائب و محاسن کلام سے نہ خود واقف ہیں اور نہ کسی کے کلام میں دیکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مناسب الفاظ کے بغیر مفہوم بھی ادا نہیں ہو سکتا اور اس طرح وہ غیر شعوری انداز سے فن شعر گوئی سے متاثر ہوتے ہیں۔ مگر شعوری انداز سے، فن کو فن سمجھتے ہوئے وہ مفہوم سے ہٹ کر شعر کو نہیں دیکھتے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اکثر بڑے نقاد خود شاعر نہیں ہیں۔ صرف نثر لکھتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ جو آدمی خود شعر نہیں کہتا وہ کتنا ہی پڑھا لکھا کیوں نہ ہو۔ ان دشواریوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا جو ایک شاعر کو پیش آتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہر شاعر کی زندگی میں ایسے بہت سے مواقع آتے ہیں۔ جب نہایت حسین اور لطیف شعر بغیر کسی محنت یا دشواری کے ہو جاتے ہیں۔ اسے کچھ لوگ اتفاق کہتے ہیں۔ اور کچھ الہام، مگر دونوں ہی غلط ہیں۔ یہ سب شاعر کے دماغ کی اپج ہوتی ہے۔ دماغ غیر محسوس طریقے سے بھی مصروف رہتا ہے۔ یہ اتفاق اس طرح کا اتفاق محض نہیں ہے جیسے آپکے نام لاٹری کھل جاتے یہ اتفاق بھی انھیں کو پیش آتا ہے جو اس کے قابل ہوتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ گھٹیا درجہ کے شاعر کی زندگی میں اتفاق سے بلند درجہ کا ایک شعر بھی نہیں ہوتا۔ مگر اچھے شاعروں کو بھی اس اتفاق پر اختیار نہیں ہوتا۔ اور فن کار محض اتفاق پر ہی تو منحصر نہیں رہ سکتا۔ اسے قدرت ہونی چاہیئے کہ وہ جب چاہے اپنے معیار کے مطابق ارادہ اور قصد کر کے شعر کہہ سکے اسی کو قادر الکلامی یا فن دانی کہتے ہیں۔

ہزاروں باتیں اتنی معمولی اور چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں کہ انہیں پہلے سے سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ بحر و وزن اور ردیف و قافیہ ابتدائی چیزیں ہیں مگر ان میں بھی بڑے پیچ ہوتے ہیں۔ اور اکثر لوگ غلطیاں کر جاتے ہیں۔ اچھے شعر میں بحر بھی مفہوم کی مددگار ہوتی ہے۔ نظموں میں بحر کو بہت دخل ہوتا ہے۔ اچھے شاعر بحروں کے نباض اور مزاج داں ہوتے ہیں اور مضمون کے مطابق ہی بحر بھی انتخاب کرتے ہیں۔ اسی طرح بلند پایہ اشعار میں قافیہ صرف تک کیلئے ہی نہیں لایا جاتا۔ اس کا ایک مقام ہوتا ہے۔ ردیف اور خاص طور سے بڑی ردیف کا صحیح اور برمحل ہونا شعر کے لفظی و معنوی حسن کے لئے لازمی ہے۔ زبان کے معاملے میں بھی بڑی نزاکتیں ہوتی ہیں۔ خاص طور سے غزل اس معاملہ میں بیحد نازک مزاج ہے۔ غزل کے شعر میں دو مصرعے ہوتے ہیں ان مصرعوں کو اس طرح مربوط کرنا کہ دونوں مل کر یکائی ہو جائیں۔ ایک شعری کارنامہ ہے۔ آجکل رعایت لفظی بہت بدنام ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ رعایت لفظی برائے رعایت لفظی ایک بیکار اور بھس سی بات ہے مگر اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کہ شعر میں اگر الفاظ انمل بے جوڑ ہیں تو بات کتنی ہی بڑی کیوں نہ کہی گئی ہو بے مزہ ہو جائے گی۔ اور اگر الفاظ کے رشتے برمحل جاتے ہیں تو معمولی مفہوم کا شعر بھی تاثیر میں تلوار ہو جاتا ہے۔

شاہ ظفر نہیں ــــــ مضطر خیر آبادی

یونس حسنی

ادبی معاملات میں بعض غلط فہمیاں بڑی دلچسپ بھی ہوتی ہیں اور دیرپا بھی یہ غلط فہمیاں کچھ ایسی شکل اختیار کر لیتی ہیں کہ ان کی اصلاح بجائے خود غلطی نظر آنے لگتی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ایک ایسی ہی غلط فہمی کی طرف اشارہ ہے جو بہادر شاہ ظفر سے ایک غزل کے غلط انتساب کے سلسلے میں پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

فلم "لال قلعہ" میں بھی یہ غزل شامل کی گئی ہے اور فلم میں اسے بہادر شاہ ظفر کی زبان سے ادا کیا گیا ہے۔ فلم میں کسی غزل کے شامل ــــ ہو جانے کے بعد اس کی جو شہرت ہو سکتی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

لیکن ادبی حلقوں میں اس غزل کے ظفر سے انتساب کی ذمہ داری بڑی حد تک ظفر کے اس انتخاب پر عاید ہوتی ہے جو "نوائے ظفر" کے نام سے انجمن ترقی اردو ہند نے فروری ۱۹۵۸ء میں شائع کیا ہے۔ اس انتخاب کو جناب خلیل الرحمٰن اعظمی نے بڑی کاوش سے مرتب کیا ہے۔ انتخاب میں ظفر کا وہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے جو ان کے کلیات میں موجود نہیں ہے بلکہ مختلف تذکروں، بیاضوں، گلدستوں، مجموعوں، ڈائریوں اور اسی قسم کی دوسری کتابوں سے ماخوذ ہے۔ اس کلام کا بیشتر حصہ ظفر کے قیام رنگون کی یادگار ہے۔ مذکورہ بالا غزل کا ماخذ بھی یہی کتابیں ہیں۔

۱۹۳۸ء میں جب رسالہ "سہیل" جناب آل احمد سرور کی ادارت میں نکلا کرتا تھا اس وقت جاں نثار اختر صاحب اس میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس غزل کو اپنے والد مضطر خیر آبادی مرحوم سے منسوب کیا تھا۔ شاید "نوائے ظفر" کی ترتیب کے وقت فاضل مرتب کے پیش نظر جاں نثار صاحب کا یہ مضمون نہیں رہا۔ ورنہ یہ غلطی نہیں ہونے پاتی۔

جاں نثار صاحب کے اس مضمون سے قطع نظر ظفر سے منسوب غزل میں خود بعض ایسی داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ جن کے پیش نظر اسے ظفر کی غزل سمجھنے میں تکلف ہوتا ہے۔ مثلاً اس غزل میں صرف پانچ شعر ہیں۔ جن میں مقطع بھی شامل نہیں ہے۔ ظفر جس دور میں شعر کہہ رہے تھے اس زمانے میں غزل گوئی کے اصول اس قدر جامد تھے کہ ان سے روگردانی ممکن نہ تھی۔ ظفر جیسے روایت پسند شاعر سے تو اس کی توقع کی ہی نہیں جا سکتی غزل میں مقطع شامل نہ کرنے کو اس زمانے میں کوئی مبتدی بھی روا نہیں رکھتا تھا۔ چہ جائے کہ ظفر جیسا استاد بغیر مقطع کی غزل کہے اس اصول پر سختی سے پابندی کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ چار ضخیم جلدوں پر مشتمل کلیات ظفر میں شاید ایک غزل بھی ایسی نہیں جو بلا مقطع کی ہو۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قید و بند کی صعوبتوں میں ظفر پر جو کچھ بیت رہی تھی جو جذبات ان کے دل میں موجزن تھے۔ ان کا سیدھا سادہ اظہار کر دیا گیا ہے۔ ایسے موقعوں پر فن کے اظہار کا زیادہ موقع نہیں ہوتا بلکہ توجہ اظہار جذبات کی طرف ملتفت رہتی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں معلوم ہوتی۔ ظفر کے کلام

سے منسوب غزل کے تیسرے شعر کا مصرعِ اولیٰ یہ ہے۔ ؎

نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں، نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں

اس مصرع میں "نہ تو میں" کی تکرار کانوں کو بری لگتی اور ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ بھرتی کے ہیں۔ دراصل یہ شعر مضطر کی اس غزل کا مقطع ہے ؎

نہ میں مضطراں کا حبیب ہوں، نہ میں مضطراں کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں!

حالانکہ ظفر سے منسوب غزل کا اصل ماخذ ہمارے — پیش نظر نہیں ہے لیکن واقعہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحب کو ظفر کی غزل ؎

"لگتا نہیں ہے جی میرا اجڑے دیار میں"

یا اسی قسم کی دوسری غزلوں کے آہنگ سے دھوکا ہوا۔ اور زیر بحث غزل کو بھی جو اپنے آہنگ کے اعتبار سے ظفر کے قیام بنارس کی غزلوں سے مشابہ ہے۔ ظفر ہی کی غزل سمجھ لیا۔ مقطع چونکہ ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا تھا اس لئے بحر کا پیٹ بھرنے کے لئے "نہ تو میں" کے ٹکڑے کا اضافہ کر کے شعر مکمل کر لیا۔ اور اسی کو ظفر کے نام سے درج کر لیا۔ اعظمی صاحب نے "نوائے ظفر" میں ایسے ہی ناقص ماخذ سے استفادہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ نول کشور نے ۱۸۸۷ء میں کلیات ظفر کا جو پہلا ایڈیشن شائع کیا اس میں یہ غزل شامل نہیں ہے ۱۹۱۶ء میں پانچویں ایڈیشن کی اشاعت کے وقت بھی یہ غزل اس میں درج نہیں کی گئی۔ پھر "نوائے ظفر" میں بھی ظفر کے اصل کلام میں یہ غزل موجود نہیں ہے بلکہ بعض دوسرے ماخذوں سے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ حاصل کی گئی ہے، جبکہ مضطر خیرآبادی کے غیر مطبوعہ دیوان میں جو جاں نثار اختر صاحب کے پاس موجود ہے خود ان ہی کے نام سے درج ہے ایسی صورت میں جب کہ ایک غزل ایک معتبر صاحبِ دیوان شاعر کے کلام میں موجود ہو کسی یادداشت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

اتفاق سے یہ غزل مجھے مضطر کے نام سے ایک اور جگہ مل گئی۔ مضطر مرحوم کے عزیز دوست نواب فاروق حسین صاحب گوپاموی نے مضطر کے کلام کا ایک مختصر انتخاب مرتب کیا تھا۔ اس قلمی انتخاب میں یہ غزل مع مقطع کے موجود ہے۔ اس غزل میں سات شعر ہیں، دو شعر ظفر کی مبینہ غزل پر اضافہ ہیں، باقی پانچ اشعار میں بھی کہیں کہیں لفظی اختلاف موجود ہے۔ یہ مختصر انتخاب نواب صاحب مرحوم کی صاحبزادی بیگم سعیدہ حسن کے پاس بھوپال میں محفوظ ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مضطر کی اصل غزل کو بھی پیش کر دیا جائے۔ یہ غزل نواب صاحب کے انتخاب سے ہی نقل کی جا رہی ہے:۔

غزل

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
کسی کام میں جو نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

نہ دوائے دردِ جگر ہوں میں، نہ کسی کی میٹھی نظر ہوں میں
نہ اِدھر ہوں میں نہ اُدھر ہوں میں نہ شکیب ہوں نہ قرار ہوں

مرا وقت مجھ سے بچھڑ گیا مرا رنگ روپ بگڑ گیا
جو خزاں سے باغ اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی شمع لا کے جلائے کیوں کہ میں بے کسی کا مزار ہوں)
نہیں لاگ ہوں نہ لگاؤ ہوں نہ سہاگ ہوں نہ سبھاؤ ہوں
جو بگڑ گیا وہ بناؤ ہوں جو نہیں رہا وہ سنگار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا کوئی مجھ کو سن کے کریگا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں
نہ میں مضطراں کا حبیب ہوں نہ میں مضطراں کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

(ہماری زبان)

★

"از ماہ تا بہ ماہی" فارسی کا محاورہ ہے۔ جس سے مراد تمام "بلند و پست عالم" ہے۔ ماہ سے مراد چاند ہے اور ماہی سے مراد وہ مچھلی جس کے پشت پر (بہ عقیدۂ عوام) کرۂ زمین قائم ہے۔ فارسی کا یہ محاورہ ترجمہ ہے عربی محاورہ "مِنَ السّمک الی السماک" کا عربی میں سمک مچھلی کو کہتے ہیں اور سماک رامح" نام ہے۔ اس ستارہ کا جو ان کی رائے میں انتہائی بلندی پر واقع ہے۔ (انگریزی میں اسے Arcturus کہتے ہیں) اس کے قریب جو دوسرا چھوٹا ستارہ پایا جاتا ہے۔ اسے وہ سماک اعزل" کہتے ہیں۔

عربی و فارسی محاورہ میں، فرق یہ ہے۔ کہ عربی میں انتہائی بلندی کا تصور "سماک رامح" سے متعلق ہے اور فارسی میں چاند سے غالباً اس لئے کہ سماک کے لئے ان کے یہاں کوئی فارسی لفظ موجود نہ تھا۔ چنانچہ فارسی کے بعض شعرا نے "ماہ تا بہ ماہی" کی جگہ سماک اور سمک ہی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مثلاً پوربہا کا یہ شعر زلزلۂ نیشاپور کے بیان میں :-

ز زخم زلزلہ زیر و زبر شد ست چنانک
سماک زیر سمک شد سمک فراز سما

چند نایاب کتابیں

کتاب	مصنف	پیسے — روپیہ	کتاب	مصنف	قیمت
دستور الفصاحت	احمد علی یکتا لکھنوی	۵۰ —— ۷	متفرقات غالب	سید مسعود حسن رضوی	۲۵ —— ۵
نادرات شاہی	مولانا عرشی	۰۰ —— ۱۰	اوراق گل	ضمیر احمد ہاشمی	۷۵ —— ۱۸
وقائع عالم شاہی	کنور پریم کشور	۰۰ —— ۱۰	نواب کلب علی خاں خلد آشیاں .... فی حصہ		۵۰ —— ۲
سلک گوہر	مولانا عرشی	۷۵ —— ۳	رام پور انتھالوجی	جے اے چیپ مین	۵۰ —— ۱۲
سفرنامہ مخلص	ڈاکٹر اظہر علی	۷۵ —— ۸			

منیجر نگار پاکستان - کراچی ۳

ہندوستان میں کتابیں ملنے کا پتہ :- رضا لائبریری - رامپور۔

عہدِ عباسیہ کا ایک ظریف درباری شاعر

ابودُلامہ

(نیاز فتحپوری)

عہد عباسیہ سے جو دور مسلم حکومت کا شروع ہوتا ہے وہ نہ صرف دورِ سعادت و عہدِ خلفاء راشدین بلکہ امویین کے زمانہ سے بھی مختلف تھا۔ عہد رسالت و خلافت راشدہ کی سادگی و مذہبیت تو خیر بنو امیہ ہی کے زمانۂ امارت میں ختم ہو گئی تھی لیکن اس کا عربی عنصر بدستور اپنی جگہ قائم تھا اور اگر اسے خالص مذہبی نہیں تو عربی حکومت ضرور کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جب عباسئین کا دور شروع ہوا جس کا بانی دراصل ابومسلم خراسانی تھا تو عربی دور حکومت ختم ہو کر ایک دوسرے دور کا آغاز ہوا جسے ہم خالص عجمی تو نہیں، لیکن عجمی اقتدار کا دور ضرور کہہ سکتے ہیں۔

یوں تو عربی تمدن کی بہت سی خصوصیات عہد بنی امیہ ہی میں ختم ہو گئی تھیں اور جاہ و حشمت، دولت و امارت کے وہ تکلفات جو روم و فارس کے درباروں میں پائے جاتے تھے، امویین نے بھی اختیار کر لئے تھے، لیکن عہدِ عباسیہ میں ان کی ترقی کی کوئی انتہا نہ رہی اور عیش و طرب، لہو و لعب کی تمام وہ رنگینیاں اور بے اعتدالیاں جو ملوک فارس و روما کے درباروں میں پائی جاتی تھیں، عباسئین نے بھی اختیار کر لیں اور دولت و ثروت کی غلط بخشیوں کی ایک طویل داستان اپنے بعد چھوڑ گئے ——— انھیں میں سے ایک ادارہ خالص لہو و لعب اور مجالس تفریحی کا بھی تھا جس میں بہ تقلید اکاسرۂ عجم و قیاصرۂ روما کسی نہ کسی شاعر بذلہ سنج ہو یعنی Court Jester کا شمول بھی ضروری تھا۔ اور عہد عباسیہ کا سب سے پہلا ظریف شاعر اس انداز کا جس نے سفاح، منصور اور مہدی تین خلفاء کا زمانہ دیکھا۔ ابودُلامہ تھا اس کا نام زند تھا اور کوفہ کے قبیلۂ بنو اسد کا ایک حبشی غلام تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش کا علم نہیں لیکن یہ آخری اموی خلیفہ کے زمانہ میں بھی موجود تھا، گو شاعر کی حیثیت سے اسے کوئی نہ جانتا تھا۔

اس کی شاعرانہ زندگی کا آغاز اس نظم سے ہوتا ہے جو "ابومسلم خراسانی" کے واقعہ قتل پر اس نے کہی تھی۔ اسی نظم نے اسے سفاح کے دربار تک پہنچایا اور دس ہزار درہم کا انعام بھی دلوایا اس کے بعد رفتہ رفتہ اپنی غیر معمولی ذہانت و ظرافت کی وجہ سے اس نے نہ صرف سفاح بلکہ منصور و مہدی کے دربار میں بھی اتنا رسوخ ودر خور حاصل کر لیا کہ خلفاء کی مجالس تفریح کی مرکزی شخصیت ہو کر رہ گیا۔

اس کی ظریفانہ و ہجویہ شاعری اس کا ایسا بے پناہ حربہ تھا جس سے تمام اکابر امراء و فضلا بھی خائف رہتے تھے اور باوجودیکہ وہ بدترین قسم کا رند مشرب انسان تھا اور تمام حرام باتیں اس نے اپنے لئے حلال کر لی تھیں لیکن کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس سے بازپرس کرے یا اس پر حد شرعی جاری کرے۔

اس کی ظرافت و شوخی کے متعدد واقعات اغانی، کتاب الشعراء (ابن قتیبہ) فہرست ابن ندیم اور مقامات حریری میں مندرج ہیں جو عربی کی ادب کا جز ولاینفک سمجھے جاتے ہیں انھیں میں سے بعض کا تفصیلی ذکر مولانا شرر نے بھی دلگداز میں کیا تھا جس کا

اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

ایک بار سفاح نے اس کی کسی نظم پر خوش ہو کر پوچھا کہ "اس کا انعام کیا چاہتے ہو" اس نے پہلے شکاری کتا طلب کیا، وہ مل گیا تو گھوڑا طلب کیا اس کے بعد ایک غلام، ایک کنیز اور رہنے کے لئے گھر بھی مل گیا۔ لیکن اب اس نے کہا کہ "یہ سب کھائیں گے کیا اور بسر کیونکر ہوگی" منصور نے یہ سن کر کہا۔ کہ "میں تمھیں ایک سو ایکٹر مزروعہ اور ایک سو ایکٹر بنجر زمین دیتا ہوں" اس نے پوچھا کہ "بنجر زمین کیسی ہوتی ہے" منصور نے کہا "جس میں اناج نہیں اگتا" یہ سن کر ابودُلامہ بولا "تو پھر امیر المومنین ریگستان بنی اسد کی ۵ لاکھ ایکٹر زمین میں آپ کو دیتا ہوں، قبول فرمائیے" یہ سن کر سفاح ہنس پڑا اور پورے دو سو ایکٹر زمین مزروعہ اسے دیدی۔

بالکل ایسا ہی واقعہ ابوجعفر منصور کے ساتھ بھی پیش آیا کہ ایک بار جب ابودُلامہ نے اپنے افلاس و تنگدستی کا حال ایک نظم میں بیان کیا تو منصور نے اسے چھ سو ایکٹر زمین مزروعہ اور چھ سو ایکٹر بنجر دے جانے کا حکم دیدیا۔ یہ معلوم کر کے ابودُلامہ بولا کہ "اے امیر المومنین! ایسا ہی ہے تو نجف اور حیرہ کی چار ہزار ایکٹر زمین میں حضور کی نذر کرتا ہوں اور کہئے تو اس سے بھی زیادہ دے ڈالوں"

ایک مرتبہ منصور اس سے کسی غلط بیانی پر خفا ہو گیا اور حکم دیا کہ "اسے عبداللہ بن علی کے مقابلہ کیلئے روانہ کیا جائے" یہ سن کر ابودُلامہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، کیونکہ وہ حد درجہ بزدل تھا۔ اس نے عرض کیا "امیر المومنین! مجھے اس مہم پر نہ بھیجئے، میں اس قدر سبز قدم ہوں کہ جہاں جاتا ہوں ناکامی ہی ہوتی ہے" منصور نے کہا "کوئی مضائقہ نہیں میری فرخندہ فالی تمہاری نحوست پر غالب آجائے گی، فوراً تیاری کرو" اس نے عرض کیا "امیر المومنین اپنی اقبالمندی کو ایسے نازک موقع پر آزمانا مناسب نہیں، کسے خبر ہے کہ حضور کی فرخندہ فالی غالب آئے گی یا غلام کی سبز قدمی اور جہاں تک میرا تجربہ ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ غلام کی نحوست آپ کی اقبالمندی پر غالب آجائے گی" منصور نے کہا "فضول مت بکو، تمھیں جانا پڑے گا" ابودُلامہ نے کہا "میں اس سے پہلے انیس لشکروں کے ساتھ میدان جنگ میں جاچکا ہوں اور ہمیشہ میری ہی وجہ سے ان سب کو شکست ہوئی۔ اس لئے امیر المومنین کو اختیار ہے کہ اب بیسویں بار پھر اس کا تجربہ کریں۔ ہو گا وہی جو ہمیشہ ہوا ہے اور امیر المومنین کو یقیناً ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا" منصور یہ سنکر ہنس پڑا۔

ایک بار منصور نے حکم دیا کہ اہل دربار سیاہ کپڑے پہنیں، لمبی ٹوپیاں قبہ نما سر پر رکھیں، تلواروں کو پٹکوں میں لٹکائیں اور پیٹھ پر یہ آیت لکھوائیں "فسیکفیھم اللہ وھو السمیع العلیم" ابودلامہ اسی وضع میں حاضر دربار ہوا تو منصور نے اس کی صورت دیکھتے ہی پوچھا "کیا حال ہے" جواب دیا "بہت برا حال ہے" پوچھا "کیوں، خیریت تو ہے؟" عرض کیا "حضور چہرہ گھونگھٹ میں ہے تلوار چوتڑوں پر ہے اور کلام اللہ پیٹھ پیچھے" اسی سلسلہ میں اس نے دو شعر بھی کہہ کر سنائے جن کا مفہوم یہ تھا کہ "ہمیں اپنے امام سے بڑی ترقیوں کی امید تھی سو وہ یوں پوری ہوئی کہ ہماری ٹوپیاں بڑی بڑی ہو گئیں اور ایسی نظر آنے لگیں جیسے میفروش یہودیوں کے خم کپڑے میں لپیٹ کر سر پر اوندھا دئے ہوں۔

جیسا کہ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں وہ شراب کا سخت عادی تھا اور جب منصور اُسے طلب کرتا تو ہمیشہ کسی نہ کسی مے خانے ہی

میں ملنا، نماز روزہ سے بھی اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ منصور نے تنگ آکر حکم دیا کہ وہ خلیفہ کے ساتھ نماز پڑھا کرے۔ کچھ دن تو مجبوراً اس نے تعمیل کی لیکن اس کے بعد کسی نہ کسی بہانے سے اس نے چھٹکارا حاصل کر لیا تاہم منصور نے یہ شرط لگا دی کہ رمضان میں نماز تراویح وہ اس کے ساتھ پڑھا کرے۔ یہ حکم اس کے لئے بڑا عذاب تھا اور اس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ منصور کی بہن ریطہ اگر سفارش کر دے تو یہ پابندی ممکن ہے دور ہو جائے۔ یہ ریطہ کے پاس گئے اور کہا کہ "میں آپ کے والد مرحوم کا غلام ہوں اور اس وقت سخت مصیبت میں مبتلا ہوں۔ میری مدد کیجئے" ریطہ نے پوچھا "کیا بات ہے؟" اس نے کہا کہ "آپ کے بھائی (خلیفہ منصور) نے پہلے تو یہ حکم دیا کہ نماز اس کی معیت میں ادا کروں اور میں نے اس کی تعمیل کی، یہاں تک کہ قبلہ کی طرف سجدہ کرتے کرتے میری پیشانی زخمی ہو گئی۔ اب یہ حکم ہوا ہے کہ رمضان میں تراویح بھی خلیفہ کے ساتھ پڑھا کروں۔ پوچھئے کہ مجھے ان باتوں سے کیا واسطہ۔ میری عبادت تو صرف شراب پینا اور گوشت بھون بھون کر کھانا ہے۔ خدارا رحم کیجئے اور مجھے اس عذاب سے نجات دلایئے"۔ ریطہ نے جواب میں کہا کہ "اچھا شب قدر تک انتظار کرو" ابودلامہ نے کہا "حضور میں سال آئندہ کے لئے آپ سے سفارش نہیں چاہتا" اور اس کے ساتھ چند شعر موزوں کر کے سنائے جن کا مفہوم یہ تھا کہ:۔

بیوی اس شخص کے بارے میں خدا سے ڈرو جس پر سکرات کا عالم طاری ہے اور نمازیوں کے درمیان رہتے رہتے اس کے سر پر قیامت آگئی ہے۔ مجھ میں اتنی سکت کہاں کہ شب قدر کا انتظار کروں، مجھے تو اس سے پہلے ہی مر جانا ہے اے شب قدر تیری فضیلت برحق ہے۔ لیکن خدا اس ثواب کو غارت کرے جو تیس دن پاؤں تڑوا دینے کے بعد نصیب ہو۔

ریطہ یہ اشعار سن کر بہت ہنسی اور آخرکار اس کی سفارش سے ابودلامہ سے نماز تراویح کی پابندی اٹھائی گئی۔

خلیفہ مہدی جب رَے سے بغداد واپس آیا تو ابودُلامہ بھی حاضر ہوئے اور ایک نظم پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ "میں نے نذر مانی تھی کہ جب حضور اصل خیر سے واپس آئیں گے تو رسول اللہ پر درود بھیجیں گے اور میرا دامن درہموں سے بھر دیں گے"، مہدی نے ہنس کر کہا کہ "درود تو میں بھیجے دیتا ہوں" "اللھم صل علی محمد و علی آل محمد و بارک وسلم" لیکن درہم میں تمھیں ایک نہ دوں گا" ابودُلامہ نے عرض کیا "امیر المومنین کی شان سے بعید ہے کہ دو باتوں میں صرف وہ بات اختیار کریں جسے ہر شخص اختیار کر سکتا ہے۔ اس لئے آپ رسول اللہ پر درود بھیجئے یا نہ بھیجئے، درہموں سے میرا دامن بھر دینا تو بہر حال ضروری ہے"

اُردو رُباعی (فنی و تاریخی ارتقاء)

فرمان فتحپوری کا علمی و ادبی شاہکار جس میں رباعی کے فکر و فن، تاریخ و تنقید اور اس کی رفتار ارتقاء پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں وہ سب کچھ شامل ہے جو رباعی کے صنف و موضوع کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے اردو فارسی میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی اور جس میں رباعی کے فنی و تاریخی ارتقاء پر محققانہ اور عالمانہ انداز سے بحث کی گئی ہے۔

قیمت:۔ پانچ روپے (مع محصول ڈاک)

باب المُراسَلہ و المناظرہ

جوش و ہوش

(جناب سید عقیل احمد جعفری، کراچی)

مکرمی و محترمی۔ اسلام علیکم۔

دسمبر ۶۲ء کے نگار میں "جوش و ہوش" پر آپ کی تنقید دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ خوشی اس کی کہ آپ نے میری تحریر کو قابل اعتنا سمجھا اور فوراً اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت سمجھی اور افسوس یہ کہ دانستہ یا نادانستہ ہمت شکنی ہی نہیں، میری دانست میں میرے ساتھ ناانصافی بھی ہوئی ہے۔

پہلی بات یہ کہ آپ نے جوش صاحب پر اس کا اثر نہ ہونے کی وجہ سے اس کوشش کو تحصیل حاصل سمجھا۔ تعجب ہے آپ ایسا فرماتے ہیں۔ آپ جب عبادات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو کیا کبھی یہ خیال آتا ہے کہ مولانا مودودی اس سے متاثر ہوں گے — اس قسم کے جواب تو صرف اپنے ہم خیالوں کو مطمئن کرنے اور مضبوط رکھنے کے لئے دئے جاتے ہیں۔

دوسرے آپ نے اس مجموعہ میں میری شاعری سے قطع نظر فرمایا ہے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ ملاحظہ کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ تو شاعرانہ حیثیت سے بھی یہ مجموعۂ شعر میرا ۔ بملاحظہ کے (کہ) بر دنکے برعکس نظر آئے گا۔

(نگار) مجھے افسوس ہے کہ "جوش و ہوش" پر میرا تبصرہ آپ کو پسند نہیں آیا، غالباً اس لئے کہ اس کے شاعرانہ پہلو پر میں نے اظہار خیال نہیں کیا۔ یقیناً میں نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا تھا، کیونکہ میرے نزدیک خود آپکا مقصود بھی اس کتاب کی تصنیف و اشاعت سے غالباً اپنی شاعرانہ اہلیت کو بروئے کار لانا نہ تھا۔ بلکہ محض فریضۂ مذہبی ادا کرنا تھا، لیکن اب آپ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ نے اسے زیادہ تر ایک "ادب پارہ" ہی کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

بے شک یہ میری غلط فہمی تھی، لیکن افسوس ہے کہ آپ کی اس تحریر کے بعد بھی میں بدستور اپنی غلطی پر قائم ہوں، کیونکہ آپ کی یہ تصنیف جس میں آپ نے جوش ہی کے بعض الفاظ میں رد و بدل کر کے اسے محض ایک طنزیہ چیز بنا دیا ہے۔ آپ کی ذہانت یا جودت طبع کے ثبوت میں تو بے شک پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن آپ کی شاعرانہ اہلیت پر اس سے کوئی روشنی نہیں پڑتی اور اگر آپ اس سلسلہ میں یہ سوال کر بیٹھے کہ "کیوں؟" تو میں اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ کہ

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشہ بما رسد

آپ نے اپنی تحریر میں ایک اور عجیب بات کہی ہے وہ یہ کہ — "اس قسم کے جواب اپنے ہم خیالوں کو مطمئن کرنے کے لئے دیئے جاتے ہیں"۔ —

میں نہیں سمجھا کہ جوشؔ کے کلام کی اثر انگیزی کا اعتراف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنے ہم خیال حضرات کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا اور اس کو دور کرنے یا اپنے حلقۂ احباب کو اس کی مضرت سے محفوظ رکھنے کے لئے، جوشؔ کے خیالات کی تردید کو آپ نے ضروری سمجھا، حالانکہ معاملہ دراصل "مجال گفتن دِہ" کا نہیں بلکہ محض "شگفتہ باور کن" کا تھا کیونکہ جوشؔ نے جو کچھ لکھا وہ محض ان کا کھلنڈرا پن تھا یا صرف شاعرانہ اپج یا تعلّی اور اسی حیثیت سے لوگوں نے اسے دیکھا تھا — بات ہنس پڑنے کی تھی نہ کہ غصّہ کرنے کی — لیکن آپ نے اپنے شدید جذبۂ ایمانی سے مجبور ہو کر (جسکی میں بڑی قدر کرتا ہوں) اسے خواہ مخواہ اتنی اہمیت دیدی کہ بقول شخصے :-

"غصہ میں ان کو کچھ نہ رہا تن بدن کا ہوش" اور اس کے جواب میں آپ خود اپنی سنجیدگی کھو بیٹھے۔

حیرت ہے کہ مذہب و خدائے مذہب کے باب میں صوفی شعراء کی تلخ نوائیوں کو دنیا "نوشِ جاں" سمجھ کر گوارا کرے حالانکہ وہ عالم ہوش و حواس کی باتیں ہیں اور غریب جوشؔ کی بے باکیوں کو جو ایک محض رندانہ بیخودی کا اظہار ہے "نیشِ ایمان" قرار دیا جائے! سچ پوچھئے تو جوشؔ کا یہ رنگ سخن مجھے بھی ناپسند ہے نہ صرف اس لئے کہ اس سے اہل مذہب کو تکلیف پہونچتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ کنایہ کی بلاغت سے معرّیٰ ہے، لیکن اس کو مذہبی طعن و تشنیع کا مورد قرار دینا بھی کوئی معقول بات نہیں۔

آپ نے اپنی تحریر میں ایک چبھتی ہوئی بات میرے متعلق بھی کہہ دی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادات کو میں غیر ضروری سمجھتا ہوں، اگر یہ بات کسی ایسے شخص کی زبان سے نکلتی جس نے میری تحریروں کا مطالعہ ہمیشہ معاندانہ نقطۂ نظر سے کیا ہے، تو مجھے تعجب نہ ہوتا، لیکن حیرت ہے کہ آپ بھی باوجود میرے حقیقی معتقدات کا علم رکھنے کے ایسا فرماتے ہیں :-

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

میں نے ہمیشہ عبادات کو تعلیم اسلامی کا ضروری جزو خیال کیا ہے کیونکہ جس بلندیٔ اخلاق کی تعلیم اسلام نے دی ہے وہ "نفسیات اجتماعی" کے پیش نظر بھی کسی مخصوص منہاج کی پابندی کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسی کے ساتھ میں نے عبادات کی بے جان رسمی حیثیت سے ضرور اختلاف کیا ہے اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ اگر ہمارے مذہبی شعائر ہم میں "تعبد و عبدیت" کی وہ روح پیدا نہیں کر سکتے جو خدا کے صحیح تصور کی وساطت سے ہیئت اجتماعی اور جامعۂ بشری کے اتحاد و ترقی کی ضروری کڑی ہے، تو ہماری جملہ عبادات بیکار ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے ایک شخص کوٹھے پر جانے کے لئے زینہ تعمیر کرائے لیکن وہ زینہ ہی تک پہونچ کر ٹھہر جائے اور اوپر جانے کا خیال ترک کر دے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے اس سلسلہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ذکر کیوں چھیڑ دیا۔ کیا فلسفۂ عبادت کے متعلق ان کا نقطۂ نظر اس سے مختلف ہے؟ "وائے گر از پسِ امروز بوَد فردائے"

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی جس کی توضیح یا تردید میں نے اس لئے نہیں کی کہ آپ مجھے مسلمان ضرور سمجھ لیں، بلکہ محض اس لئے کہ آپ پر بھی یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ کفر و اسلام کا فرق کوئی جذباتی و اصطلاحی فرق نہیں ہے بلکہ اخلاق و عمل کا فرق ہے جس کا تعلق غالباً خشونت سے نہیں بلکہ نرمی و لینت سے ہے۔

رہا سوال آپکی شاعرانہ اہلیت کا، سو جوشؔ و ہوشؔ کے تبصرہ کے سلسلہ میں اس کے اظہار کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ کیونکہ آپ نے خود اس کتاب میں اپنے آپکو شاعر نہیں بلکہ واعظ و محتسب کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر اس پر اظہار خیال کیا گیا تھا ورنہ یوں ہی میں آپکی شاعری کا معترف ہوں آپ کو خوش گو شاعر سمجھتا ہوں۔ آپ کے کلام سے میں نے بارہا لطف اٹھایا ہے اور اب بھی جب شاعرانہ خوش دلی کے ساتھ آپ کوئی چیز پیش کریں گے تو میں اسکی پوری داد دوں گا۔

نذرِ جاں، پیشکشِ دل میں کسے عذر مگر
وہ دکھائیں تو سہی چہرۂ زیبا اپنا

باب الاستفسار

(۱)

صابئین کون تھے؟

(سید مظہر حسین۔ الہ آباد)

قرآن پاک میں صابئین کا ذکر نصاریٰ کے ساتھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ ان کے صاحب کتاب ہونے کا یقین ہوتا ہے، حالانکہ بعض مورخین انھیں ستارہ پرست جماعت کہتے ہیں۔ ان دونوں باتوں میں تضاد ہے۔ آپ کی رائے اس باب میں کیا ہے؟۔

(نگار) صابئین کا ذکر کلام مجید میں تین جگہ پایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے سورۂ بقر میں، اس کے بعد سورۂ مائدہ میں اور پھر سورۂ حج میں — سورۂ بقر کی آیت یہ ہے۔

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ
والصابئین من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحاً فلھم
اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا یحزنون

اس آیت میں مومنین کے ساتھ (والذین ھادوا) یہود، نصاریٰ اور صابئین کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور ان سب کی نجات کا وعدہ کیا گیا ہے بشرطیکہ وہ اللہ، یوم آخرت پر ایمان لائیں اور اچھے کام کریں، سورۂ مائدہ کے الفاظ بھی بالکل یہی ہیں اور ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح صابئین کو بھی اہل کتاب قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سورۂ حج کی آیت میں یہود و نصاریٰ اور صابئین کے ساتھ نہ صرف مجوس بلکہ مشرکین کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والصابئین والنصاریٰ
والمجوس والذین اشرکوا، ان اللہ یفصل بینھم یوم القیامۃ

جس سے اہل کتاب و غیر اہل کتاب کی تفریق مٹ جاتی ہے اور غیر مشرکین کی طرح مجوس (پیروان زردشت) بھی غیر اہل کتاب قرار پاتے ہیں۔— لیکن باوجود اختلاف احادیث کے اکثر فقہاء اسلام کا رجحان یہی ہے کہ مجوس اہل کتاب ہیں اور اسی لئے نصاریٰ و یہود کی طرح ان سے بھی جزیہ لیا جاتا تھا — خیر یہ تو محض ضمنی بات تھی جو علیحدہ تفصیلی گفتگو کی محتاج ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ صابئین صاحب کتاب تھے یا نہیں نیز یہ کہ اگر ان کا مذہب ستارہ پرستی تھا تو وہ یقیناً مشرک تھے اور کلام پاک میں یہود و نصاریٰ (دوسرے اہل کتاب فرقوں کے) ساتھ ان کا ذکر کیوں کیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ صابئین صاحب کتاب بھی تھے اور مشرک بھی لیکن یہ دونوں فرقے مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں پائے جاتے تھے۔

مغربی ایشیا میں، قدیم بابلی عہد تمدن اپنے بعد جو آثار چھوڑ گیا تھا، ان میں مانوی مذہب کے علاوہ ایک مندائی مسلک بھی تھا جس کا مستقر کالدیا (واسط اور بصرہ) کا درمیانی علاقہ تھا، انہیں صابئین بھی کہتے تھے یعنی وہ جماعت ہے جو ملک صباء سے تعلق رکھتی تھی۔ لفظ صباء عبرانی لفظ صبیح کی مسخ شدہ صورت ہے جس کے معنی غسل کرنے کے ہیں اور چونکہ یہ جماعت نہانے دھونے کی سخت عادی تھی۔ اس لئے اہل عرب علاوہ صابئین کے انہیں "المغتسلہ"۔ (غسل کرنے والے) بھی کہنے لگے۔ سترھویں صدی کے پرتگالی بحری سیاحوں نے یہ سمجھ کر کہ وہ پانی کے ذریعہ سے بپتسمہ کی رسم ادا کرتے ہیں، انھیں سینٹ جان بیپٹسٹ فرقہ کا عیسائی قرار دیا۔

یہ تھا ذکر ان اصلی صابئین کا جو قدیم بابلی عہد کے یادگار تھے اور جنہیں رسول اللہ کے زمانہ میں موحد سمجھا جاتا تھا —— اب ان مصنوعی صابئین کا حال بھی سن لیجئے، جنہیں صابئین حرآن کہا جاتا ہے اور جن کا تاریخی تعلق تیسری صدی ہجری کے آغاز سے ہے جب خلیفہ ماموں الرشید عباسی بازنطینی حکومت کے خلاف فوج کشی کے دوران میں حرآن سے گذرا جو حلب کے راستہ میں واقع تھا تو یہاں کے بہت سے لوگ اس سے ملنے آئے، ان میں بعض ایسے مشرک بھی تھے جن کی وضع و قطع دیکھ کر وہ بہت متعجب ہوا، بڑے بڑے بال ان کی پیٹھ پر لہرا رہے تھے اور نہایت چست قبائیں ان کے جسم پر تھیں ماموں نے ان سے پوچھا "تم کون ہو" انہوں نے جواب دیا۔ "ہم حرآنی ہیں" ماموں نے سوال کیا۔ "تمہارا مذہب کیا ہے" انہوں نے کہا "ہم نہ عیسائی ہیں، نہ یہودی، نہ مجوسی" ماموں نے پھر سوال کیا "تم کس پیغمبر اور کس کتاب الہٰی کے ماننے والے ہو" لیکن اس کا وہ کوئی اطمینان بخش جواب نہ دے سکے اور ماموں نے کہا کہ "تم کچھ نہیں ہو۔ محض زندیق ہو، اس لئے یا تو تم مسلمان ہو جاؤ یا کوئی اور الہامی مذہب اختیار کر لو۔ ورنہ میں لوٹ کر تم سب کو قتل کرا دوں گا اگر میں نے تمہیں اسی زندقہ میں مبتلا پایا" —— ماموں کا یہ فیصلہ سن کر ان میں سے بعض بال کٹوا کر اور تنگ قبائیں ترک کر کے مسیحی ہو گئے اور بعض مسلمان، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنا آبائی مذہب نہیں چھوڑا اور ہلاکت سے بچنے کے لئے انہوں نے کسی فقیہہ سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ جب ماموں واپس آئے اور تم سے مذہب کے بارے میں سوال کرے تو تم کہہ دینا کہ "ہم صابئی ہیں" جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ اتفاق سے ماموں کا اسی دوران میں انتقال ہو گیا اور حرآن واپس نہ آ سکا لیکن حرآن میں یہ مصنوعی صابئی جماعت ہمیشہ کے لئے قائم ہو گئی —

(۲)

یہ مُنہ اور مُسور کی دال

(علی حسین صاحب، اجمیر)

"یہ منہ اور مسور کی دال" کا بڑا مشہور محاورہ ہے، جو اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی شخص اپنی اہلیت سے زیادہ کسی بات کا متمنی ہو —— لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ "مسور کی دال" کون سی ایسی نادر شے ہے جس کے کھانے کے لئے کسی خاص قابلیت کی ضرورت ہے۔

(نگار) اردو میں یہ محاورہ واقعی اسی محل پر استعمال ہوتا ہے، جو آپ نے ظاہر کیا ہے، لیکن یہ مسخ شدہ محاورہ ہے۔

اردو کے بہت سے مروجہ محاورے ایسے ہیں جو دراصل کچھ اور تھے بعد کو عوام نے انہیں مسخ کر دیا، جیسے عورتوں کا محاورہ "منوج" کہ یہ نعوذ باللہ کی مسخ شدہ صورت ہے یا "افراتفری"، کہ یہ دراصل افراط و تفریط تھا۔

آپ نے جس محاورہ کا ذکر کیا ہے وہ اصل میں یوں تھا:-

"یہ منہ اور منصور کی دار"

منصور کے انا الحق کہنے اور دار پر چڑھائے جانے کے مشہور واقعہ سے تعلق رکھتا ہے، لیکن عوام نے منصور کو مسور کر دیا اور دار کو دال بنا دیا

(۳)

امام ابو حنیفہ کا اصل خاندان سندھی تھا

(سید مہر حسین۔ بھاگلپور)

مجھے اس وقت یاد نہیں آتا لیکن کسی تاریخ میں، جو بجنور سے شائع ہوئی تھی، میں نے یہ بات لکھی ہوئی دیکھی تھی کہ امام ابو حنیفہ جاٹ نسل سے تھے اور چونکہ جاٹ ہندوستانی قوم ہے اور ہندو مذہب رکھتی ہے اس لئے اس کے معنی یہ ہوئے کہ امام ابو حنیفہ کا نسل ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

(نگار)۔ بعض عربی مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے دادا کا نام زطؔ یا زاطؔ تھا جو مسلم فتوحات کے سلسلہ میں جنگی قیدی یا غلام کی حیثیت سے فارس سے کوفہ آ گئے تھے۔ یہاں پہونچ کر وہ اسلام لے آئے اور قبیلۂ بنی تیمم کے مولیٰ ہو گئے (جو جنگی قیدی غلام کی حیثیت سے لائے جاتے تھے وہ مسلمان ہو جانے کے بعد آزاد سمجھے جاتے تھے اور اپنے مالک کے قبیلہ کے مولیٰ کہلاتے تھے)۔ ابو حنیفہ کے والد ثابت اور خود ابو حنیفہ بھی یہیں پیدا ہوئے (۸۰ھ)۔

چونکہ عربی میں ج کو ز اور ٹ کو ط میں بدل دینا عام بات ہے، اس لئے عربوں نے جاٹ کو زاطؔ یا زطؔ کر دیا، لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے کہ زطؔ، ابو حنیفہ کے دادا کا نام تھا، بلکہ یہ نام تھا اسی جماعت کا جو سندھ سے ایران چلی گئی تھی۔ اور جس کا نام جاٹ یا جٹ عربی میں زاطؔ یا زطؔ ہو گیا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زطؔ یا جٹ سے مراد وہی قوم ہے جو سرزمین ہند سے تعلق رکھتی تھی تو وہ فارس کب اور کیونکر پہنچی؟

اگر آپ تاریخ سندھ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ آریہ قوم ایک ہزار سال قبل ولادت مسیح وادیٔ سندھ میں آ کر آباد ہو چکی تھی اور ۵۰۰ سال قبل مسیح تک یہاں برسر اقتدار رہی۔ اس کے بعد دارا (فرمانروائے فارس) نے وادیٔ سندھ کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

جب ۳۲۵ ق۔م میں اسکندر اعظم نے سندھ فتح کیا تو فارسی حکومت اس وقت یہاں ختم ہو چکی تھی لیکن ایک عرصہ تک ایرانی حکومت قائم رہنے کی وجہ سے سندھیوں اور اہل فارس کے تعلقات چونکہ کافی وسیع ہو چکے تھے اس لئے جب ایرانی یہاں سے جانے لگے تو سندھ کے بعض

وہ خاندان بھی (جو ایرانی فوج میں شامل تھے) ان کے ساتھ ایران چلے گئے اور انہیں میں ایک خاندان زط یا جٹ کا بھی تھا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آیا اس وقت سندھ میں کوئی قوم جٹ یا زط نام کی آباد تھی یا نہیں اور اگر تھی تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ بعد کو ایران پہونچ گئی۔

اس امر کی تحقیق کے سلسلہ میں جب ہم عربی کے قدیم ترین مورخ بلاذری کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ زط یا جٹ قوم وادیٔ سندھ سے تعلق رکھتی تھی۔

بلاذری ایک جگہ لکھتا ہے :۔

" اہل فارس جب سندھ سے واپس گئے تو یہاں کی تین قوموں کے متعدد افراد کو (جو ان کی فوج میں ملازم تھے) اپنے ساتھ لے گئے ان قوموں کے نام یہ تھے :۔

سیابجہ - اندغار - اور — زط

دوسری جگہ لکھتا ہے کہ :۔

خلیفۂ ثانی کے زمانہ میں بحرین کی فوج میں سیابجہ اور زط بھی شامل تھے۔

تیسری جگہ لکھتا ہے کہ :۔

جب حضرت عمر کے عہد میں فارس کو شکست ہوئی تو اور اس کی اسوارکیا سوار فوج اسلام قبول کر کے عساکر اسلامی میں شامل ہو گئی تو اس کے بعد سیابجہ اور زط بھی ان کے تتبع میں اسلام لے آئے اور قبیلۂ بنی تمیم کے موالی ہو گئے۔

چوتھی جگہ لکھتا ہے کہ :۔

" کوفہ کی وہ فوج جو حضرت علی کی حامی تھی، اس میں سیابجہ اور زط کے افراد بھی شامل تھے"۔

بلاذری کے ان بیانات سے ایک بات تو یہ صاف ہو جاتی ہے کہ زط، ابو حنیفہ کے دادا کا نام نہ تھا بلکہ وہ ایک قوم تھی جو سندھ سے فارس آ گئی تھی، دوسری یہ کہ سکندر کے حملۂ سندھ سے پہلے ہی زط قوم کے بہت سے افراد ایران منتقل ہو گئے تھے تیسری یہ کہ فتوحات اسلامی سے پہلے ہی زط قوم کے افراد سرزمین عرب پہونچ گئے تھے اور چونکہ یہ سپاہی پیشہ لوگ تھے اس لئے بحرین کی فوج میں ملازم ہو گئے تھے۔ چوتھی یہ کہ حضرت عمر کے زمانہ میں ایران کے جو زط افراد اسلام لے آئے تھے وہ کوفہ میں آباد تھے اور حضرت علی کے طرفداروں میں تھے - اور ہو سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا علویین کی حمایت کرنا بھی اسی وجہ سے رہا ہو کہ وہ خود زط یا جٹ قوم کے فرد تھے جو زمانۂ قدیم میں سندھ سے ایران پہونچی اور جب ایران سے عرب پہونچی تو اسلام لے آئی۔

ولایت کے ایک وکیل کو جب جج کا عہدہ تفویض کیا گیا تو اس نے چیف جسٹس سے ذاتی مشورہ طلب کیا کہ ایک جج کی حیثیت سے مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

چیف جسٹس نے کہا کہ " اس کا صرف ایک ہی مناسب طریقہ ہے وہ یہ کہ " وکیل جب تک بحث کرتا رہے، برابر اس سے نظر ملائے رہو۔ لیکن جو کچھ وہ کہے اسے سُنو نہیں۔

رباعیات

جوش ملیح آبادی

★

اس دھن میں کہ دل فکر کے شیدا ہو جائیں آفاق کے اسرار ہویدا ہو جائیں
مدت سے گرا رہا ہوں تخمِ معنیٰ شاید کہ نئے درخت پیدا ہو جائیں

جب شمعِ تامل کو جلایا میں نے اسرار کا فولاد تپایا میں نے!
ادراک کی میزان میں رکھا جس وقت سائے میں بھی وزن و جسم پایا میں نے

طوفانِ لطافت سے خدارا ہشیار الوانِ حریر و پرنیاں ہیں خوں خوار
ہر برگ کی ندرت میں نہاں ہے نشتر ہر پھول کی خوشبو میں چھپی ہے تلوار

یہ دھن ہے کہ جیب میں ہوں ماہ و پرویں قطبین ہوں کم سے کم مرے زیرِ نگیں
آگاہی "بود و ہست" کے یہ نعلین چھوٹے ہیں بہت، پاؤں میں آئیں گے نہیں

اسرار کی لو تپائے جاتی ہے مجھے! افکار کی دھن گھلائے جاتی ہے مجھے
نشے میں بھی رہتی ہے معارف کی کرید یہ علم کی بھوک کھائے جاتی ہے مجھے

آنسو، موتی، چکور، تلوار، ہلال، مکھڑے، جگنو، عبیر، افشاں، خلخال
سنبل، بلبل، گلال، چومک، طاؤس بدلے کل ایک لے نے کتنے اشکال

★

منظومات

(فضا ابن فیضی)

نفس تمام خراش

صبا کا درد نہ سمجھا کوئی کلی کے سوا — مرے لبوں کو تو سب کچھ ملا ہنسی کے سوا
یہ التفاتِ نظر کا عجیب عالم ہے — جہاں پہ زخم نہیں ہیں وہیں پہ مرہم ہے
غمِ حیات کی کیسے کہوں خلش کم ہے — نصیب دل کو نہیں کچھ شکستگی کے سوا

ترس گیا نگہ لطفِ ماجرا کے لئے — میں اجنبی ہی رہا اپنے آشنا کے لئے
جو دل رُبا تھی ملامت فروش ہے وہ نظر — لہو میں ڈوبا ہوا ہوں خود اپنے تا بہ کمر
جو ہنس سکو تو ہنسو اس الم نصیبی پر — کہ چن لیا ہے مجھے وقت نے سزا کے لئے

وہ غنچہ ہو قدحِ لالہ ہو کہ گل کا ایاغ، — کہیں بہار نے پایا نہ مستیوں کا سراغ
صراحیوں میں لہو آرزو کا ڈھلتا ہے — یہ زندگی ہے کہ شعلوں میں پھول پلتا ہے
خود اپنی آگ میں جیون کا روپ جلتا ہے — نفس نفس میں ہیں روشن جراحتوں کے چراغ

خلوص کے ہوں وہ شیشے کہ لغزشوں کی ہوس — مرے لئے ہے زمانے کی ہر ادا قاتل!
ہر اک نفس ہے جب اپنی ہی تیر سے گھائل — ہے عشق کس سے سکونِ حیات کا سائل
کوئی نگاہ نہیں التفات پر مائل! — چلا ہوں لے کے کہاں تحفۂ جراحتِ دل

تپائے اور غم و درد کا شباب مجھے — پلائے اور کوئی زہرِ اضطراب مجھے
ابھی نظر میں ہجومِ شکستِ رنگ نہیں — ابھی تو پہلوئے گل میں کوئی خدنگ نہیں
ابھی جنوں کی فضائیں لہو ترنگ نہیں — تراشنے ہیں ابھی زخم سے گلاب مجھے

جہاں پہ پھول تھے، کانٹے وہاں پہ بوتا ہوں — میں کہہ کے حرفِ وفا منہ کی بات کھوتا ہوں
سلگ رہی ہے یہ احساس میں چبھن کیسی — مژہ کی نوک ہے یا نوکِ خارِ بستر کی
ہزار چاہا کہ سو جاؤں آنکھ لگ نہ سکی — تمام رات یہ کن نشتروں پہ سوتا ہوں

سلگتی جاتی ہوئی حسرتوں میں پلتے ہیں
خود اپنے جام میں ہم زہر بن کے ڈھلتے ہیں

علاج تشنہ لبی کا نہیں یہ پیمانے !
گئے کہاں مجھے آواز دے کے میخانے !

اس انجمن میں تو ایسے بھی کچھ ہیں پروانے
جو رہ کے اپنے چراغوں سے دور جلتے ہیں

یہی بہت ہے کہ عنواں جنوں کو مل جائیں
کہاں وہ حسن کہ نظروں میں پھول کھل جائیں

صنم کدوں کا فسونِ جمال دیکھ لیا
بیک نگاہ زمانے کا حال دیکھ لیا

وفا بھی کر کے وفا کا مآل دیکھ لیا
مجھے یہ ڈر ہے نہ سینے کے زخم چھل جائیں

اداس ہوں دلِ عاشق کی آرزو کی طرح
خود انجمن میں ہوں ٹوٹے ہوئے سبو کی طرح

الگ ہے سب سے مری وضع جیب و پیراہن
مرا وجود ہے گلنار مستیوں کا کفن

یہ کہہ دو نکہت گل سے ابھی تمام چمن
مہک رہا ہے مرے خون مشکبو کی طرح

یہ کرب و غم کا سویرا یہ سوتی جاگتی آس
نغانِ نیم شبی چپ چپ دل کا درد اداس

چلو کہ پیار تو کر لوں ستم تماشوں کو
سجا لوں پلکوں پہ زخم جگر کی قاشوں کو

چھپاؤں کس لیئے احساس کی خراشوں کو
کہ ایسے کم تو نہ ہوگی اذیت احساس

جلن ہے زخموں میں چلتی ہیں گو ہوائیں سرد
مری حیات ہے تنہا غموں کی راہ نورد

یہ کس نے زہر ملایا ہے پیار کے رس میں
سمٹ گئیں ہیں غم جاں گداز کے بس میں

بڑا کرم ہو جو تقسیم کر لو آپس میں !
مرے شعور کی تلخی ، مرے ضمیر کا درد

اٹھائے پھرتا ہوں میں دوش پر خود اپنی لاش
مرے چراغ کو ہے اب کن آندھیوں کی تلاش

مہکتے زخموں کے یہ پھول آنسوؤں کے یہ جام
زفرق تا بہ قدم ہوں بہار کا انعام

برنگِ لالہ چمن میں بکھر گئی ہے تمام
مری نظر کی جراحت ، مرے نفس کی خراش

خدا کوئی سہی

(دانش فرازی)

کیا یہی دنیا ہے جس کے حلقۂ آغوش میں — زندگی نے آنکھ کھولی تھی تبسم کے لئے
بے خبر تھی شیوۂ گریہ سے شبنم کی پھوار — تھے خزاں ناآشنا پھولوں کے دلکش قافلے
کس میں ہمت تھی کہ چھیڑے قصۂ دام و قفس — چھن رہے تھے جب لچکتی ڈالیوں سے زمزمے
کون تھا ایسا کہ دیکھے جس نے گلچینی کے خواب — کس نے پھولوں کے دلِ صد چاک کانٹوں سے سئے

کس قدر تھا جلوہ ساماں، بزمِ ہستی کا وجود
کس قدر بے داغ تھی صبحِ محبت کی نمود

کل اسی دنیا میں آئے تھے وہ اربابِ نظر — چھیڑتے تھے زخمۂ دل سے جو سازِ کائنات
جن کا ہر تارِ گریباں مہرِ رخشاں کی کرن — جن کے جلوؤں سے گریزاں یاس کی تاریک رات
جن کی چٹکی میں روپہلی چاندنی آفاق کی — جن کی گردِ رہروی کے ساتھ تاروں کی برات
کھولتی تھی جن کی ہر نوکِ مژہ دل کی گرہ — آشکارا جن کی ہر جنبش سے اسرارِ حیات

ڈھونڈتا ہوں وہ کہاں ہیں اُنکے جلوے ہیں کہاں
دھندلی دھندلی سی زمیں ہے، ڈوبا ڈوبا آسماں

آگ کا کیا ذکر اب شبنم کو چھو سکتا نہیں — روپ میں پھولوں کے ہیں غارت گرِ حسنِ چمن
برق کو الزام دیتے تھے کہ ہے خانہ خراب — اپنے گھر کی آگ سے جلنے لگا ہے پیرہن
قیس تو ملتے ہیں اب بھی چاک داماں و حزیں — اٹھ گیا دنیا سے آدابِ محبت کا چلن
رو رہا ہوں دیر سے دل کی برہنہ لاش پر — کاش میرے اشک ہی بن جائیں اجلا سا کفن

چارہ سازو، درد مٹ جائے دوا کوئی سہی
ہاتھ رکھ دے میرے زخموں پر خدا کوئی سہی

فضا جالندھری

ادھر کی تیرگی بخت پہ ہنسنے والے　　تو نے دیکھی ہی نہیں گردش ایام ابھی

روح پرور بن کے آئی ہے ہوائے فصل گل　　غنچے غنچے سے چھلکتی ہے شراب زندگی
ہوش آیا بھی تو کب آیا تجھے اے مے پرست　　ہو گیا لبریز جب ظرف شراب زندگی

بجلیاں پھر رہی ہیں آوارہ!　　جیسے اب آشیاں نہیں کوئی

جس طرح ٹوٹ جائے کوئی موتیوں کا ہار　　دامن پہ اُن کے اشک فضا یوں بکھر گئے

زندگی کی اداس راہوں میں　　بارہا تیری یاد آئی ہے!
آبھی جاؤ کہ اک زمانہ ہوا　　آنکھ دیدار کو ترستی ہے
لاکھ تارے ہنسیں کہ پھول کھلیں　　دل کی دنیا تو غم کی بستی ہے

★

تابش شجاع آبادی

بزم امکاں میں نہ پہلے تھا سکوں اور نہ اب　　سانس کی آمد و شد مجھ پہ گراں آج بھی ہے
تھا یہاں پہلے جو موجود رہی ہے اب بھی　　جو نگاہوں سے نہاں تھا وہ نہاں آج بھی ہے

وہ محفلیں ہوئیں برہم گئے وہ اہل نظر　　کہاں ہیں آج وہ شمع سخن کے پروانے!
کھولی بھی راز تو کس انجمن میں جاکے کھولوں　　تہی ہیں مہر و وفا سے جہاں کے کاشانے
حد منازل غم مل گئی انہیں شاید!　　جو مسکراتے ہیں خوش ہو کے غم میں دیوانے

تمہاری گلی کے جو مل جائیں ذرّے　　تو میں سینکڑوں ماہ و اختر بناؤں
مرا جذبۂ دل ہے پیغام منزل　　کہو تو میں اُن کو بلا کر دکھاؤں
وہ بے درد بن جائے ہمدرد تابشؔ　　جو میں قصۂ درد اس کو سناؤں

اکرم دھولیوی

دل کو مرے دکھاؤ جہاں تک دکھا سکو ممکن ہے کچھ دنوں میں نہ پھر مجھ کو پا سکو
مدت ہوئی ملی نہیں زخمِ جگر کی داد اک بار مسکرا دو اگر مسکرا سکو
آئینۂ خیال میں ہے رنگ ہی کچھ اور تم یوں ہمارے سامنے شاید نہ آ سکو
رسوا نہ یوں کرو کہ اگر ہو کبھی خیال مجھ سے نگاہ بھی نہ دوبارہ ملا سکو
ٹھکرا کے مجھ کو جا تو رہے ہو بصد غرور لیکن خدا کرے کوئی مجھ سا نہ پا سکو
میں کیا کہوں کہ عشق ہے خانہ خراب کیوں اس کا سبب تو تم بھی نہ شاید بتا سکو
کیا جانے کب بھڑک اٹھے یہ دل کی آگ ہے دامن بچاؤ مجھ سے جہاں تک بچا سکو

اکرم ہلاکِ کشمکشِ وقت ہو گیا
اب اس کو بھول جاؤ اگر تم بھلا سکو

★

شارق ایم اے

وہاں امتحانِ محبت نہ تھا جہاں جان دینا نہ تھی کوئی بات
رہی یوں تو اُن سے شکایت بہت نہ آئی لبوں پر شکایت کی بات
بہر گام اک عالمِ شوق ہے! محبت کی دنیا میں دن ہے نہ رات
فنا ہو کے شارق یہ سمجھا ہوں میں! محبت کا ہر غم ہے عینِ حیات!

بے خودی میں ہر نفس اُن سے ملاقاتیں ہوئیں کچھ تغافل کے گلے کچھ شکر کی باتیں ہوئیں
سوچتا ہوں جسقدر بڑھتی ہیں اتنی الجھنیں آنکھوں آنکھوں میں نجانے ان سے کیا باتیں ہوئیں
ایک نامحسوس بیگانہ وشی تھی اور ہم اُن سے اے شارق کچھ ایسی بھی ملاقاتیں ہوئیں

گذرنے کو تو شارق اپنی ہر عالم میں گذری ہے وہی ہے زندگی لیکن جو اُن کے غم میں گذری ہے!
وہ افتادِ خزاں ہو یا بہاروں کی جنوں خیزی قیامت ہم پہ سچ پوچھو تو ہر موسم میں گذری ہے

حرمت الاکرام

والبستۂ وفا ہوا جب سے ہوس کا نام — اہل خلوص پر بھی محبت ہوئی حرام
اپنے کو ڈھونڈھتا ہوں تو ملتا نہیں پتہ — اے گردش حیات! یہ ہے کون سا مقام
منزل قریب آئی تو کترا گئے ہمیں — آئے ہیں راہ زیست میں ایسے بھی کچھ مقام
دیکھا جو بیکسی پہ زمانہ کو طعنہ زن! — بے اختیار آگیا ہونٹوں پہ تیرا نام
کیا کیا نہ دے گئی ہمیں دو دن کی زندگی — اک دردِ لازوال، اک اندیشۂ دوام
تنویرِ مہر و ماہ نے لیں کتنی کروٹیں — میں سوچتا ہی رہ گیا یہ صبح ہے کہ شام
ہم میکدے میں ہیں تو سمجھ لے کہ ساقیا — سو بار ٹوٹ کر بھی کھنکتے رہیں گے جام

حرمت بھی ہے شمعِ تمنا کچھ اس طرح!
راتوں کے ساتھ ساتھ ہوئے دن بھی تیرہ فام

سعادت نظیر

شبِ غم وہ جب ناگہاں آ گئے — تو لاکھوں گماں درمیاں آ گئے
نگاہِ کرم جرأت افزا ہوئی! — ہزاروں گلے درمیاں آ گئے!
بڑھیں حد سے جب دل کی بے تابیاں — پیامِ سکوں ناگہاں آ گئے
قدم سوئے منزل اٹھایا ہی تھا — کہ دیر و حرم درمیاں آ گئے

درِ میکدہ اور سعادت نظیر
یہاں آج حضرت کہاں آ گئے

نشاط لکھنوی

دل سے کیا ہر شے سے ظاہر تھا وہ حسن لامکاں — باوجود اس کے بھی در در جستجو ہوتی رہی
بارہا تنہائیوں میں خود دلِ بیتاب سے — اپنی ناکامی کی اکثر گفتگو ہوتی رہی
اے نشاط اکثر اسی عالم میں گزری زندگی — پاس وہ موجود تھے اور جستجو ہوتی رہی

مطبوعات موصولہ

رسومِ دہلی

مولوی سید احمد دہلوی مولف "فرہنگ آصفیہ" کی تصنیف ہے۔ پہلی بار 1905ء میں مخزن پریس دہلی سے شائع ہوئی تھی اور اب ایک اب اسے اردو اکیڈیمی سندھ نے ترقی اردو بورڈ کراچی کے تعاون سے شائع کیا ہے۔ کتاب کے شروع میں جناب سید یوسف بخاری کا مقدمہ اور آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے۔ رسوم دہلی (جسے رسوم مسلمانان دہلی کہنا چاہیئے) دہلی کے مسلمانوں کی جیتی جاگتی معاشرتی تصویر ہے۔ ایسی تصویر جو نہ صرف دہلی بلکہ پورے اسلامی ہند کی نمائندگی کرتی ہے۔ ممکن ہے یہ کتاب اپنی اولین اشاعت کے وقت اہم خیال نہ کی گئی ہو لیکن اور یقیناً ایسا ہوا ہوگا۔ اسی لئے کہ اس کی دوبارہ اشاعت کی نوبت نہیں آئی لیکن آج اس کی اہمیت مُسلّم ہے۔

بات یہ ہے کہ جو چیزیں کل تک بقول حقی صاحب دیدہ و چشیدہ تھیں وہ اب محض شنیدہ ہوتی جارہی ہیں اور کیا عجب ہے کہ کچھ دنوں کے بعد شنیدہ کی صورتیں بھی باقی نہ رہیں۔ اس لئے اس قسم کی کتابیں ہماری تہذیبی و تمدنی روایات کی بڑی قیمتی دستاویزیں ہیں۔

کتاب اپنی جگہ یوں بھی مفید تھی۔ لیکن فاضل مقدمہ نگار نے اپنے جامع مقدمہ و فرہنگ سے اسے مفید تر بنادیا ہے۔ سید احمد نے انیسویں صدی تک رسم و رواج کا ذکر کیا تھا۔ لیکن فاضل مقدمہ نگار نے بیسویں صدی تک کی ان تمام روایات کو جو اصل کتاب میں درج ہونے سے رہ گئی تھیں۔ مقدمہ میں سمیٹ کر اس کتاب کو بالکل نئی صورت دے دی ہے۔

مصنف کے متعلق بھی مفید اطلاعات بہم پہونچائی گئی ہیں اور انکی تصانیف کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، لیکن بعض تصریحات ترک ہوگئی ہیں مثلاً یہ کہ "فرہنگ آصفیہ" 1892ء میں مکمل ہوئی اور سید علی بلگرامی کی سفارش پر نظام حیدرآباد کی عنایت سے اشاعت پذیر ہوسکی جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے۔ فیلن صاحب نے اپنے کام کے لئے سید احمد کو کس طرح پکڑا، اس کا ذکر بھی کتاب میں موجود نہیں ہے۔

تصانیف سید احمد کی فہرست میں "تقویت الصبیان" کا ذکر نہیں آیا حالانکہ یہ 1868ء میں شائع ہوچکی تھی۔ نمبر ۳۲ پر کتاب "مناظرہ تقدیر و تدبیر" کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ یہ کتاب کا موضوع ہے، نام نہیں۔ کتاب کا اصل نام کنز الفوائد ہے۔

سید احمد کے عہد طالب علمی کی طویل فارسی نظم "طفلی نامہ" اور 1911ء کے دربار تاجپوشی کی نظم "خیر مقدم" کا بھی ذکر ترک ہوگیا ہے۔

فاضل مقدمہ نگار کی نگاہ سے شہیر فتحپوری کا وہ طویل مقالہ نہیں گذرا جو سید احمد کی زندگی اور تالیفات پر ستمبر 1911ء کے "ادیب" میں شائع ہوا تھا، ورنہ وہ ضرور اس سے استفادہ کرتے۔

اسی طرح مقدمہ میں سید احمد کا سال وفات 1918ء ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن رام بابو سکسینہ اور مولانا حامد حسن قادری نے 1919ء تحریر کیا ہے ہوسکتا ہے کہ صحیح تاریخ وہی ہو جو مقدمہ میں ظاہر کی گئی ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ ترقی اردو بورڈ کراچی۔

جذباتِ نادر

نادر کاکوری کا مجموعہ کلام ہے جسے جناب ممتاز حسن صاحب کے مقدمے کیساتھ اردو اکیڈیمی (سندھ) نے اردو ترقی بورڈ کے تعاون سے شائع کیا ہے۔ ۳۵۰ صفحات کی یہ کتاب ٹائپ پر بڑے اہتمام سے چھاپی گئی ہے۔ کاغذ نفیس اور جلد پائیدار ہے۔ گردپوش سادہ لیکن دیدہ زیب ہے۔

پرانی کتابوں کی تدوین و ترتیب اور مختلف نسخوں سے متن کی تصحیح کا کام اتنا آسان نہیں، جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے اس قسم کے کام بڑی وسعت مطالعہ د

گہری نظر، صحت ذوق اور دقت نظر جا بجا ملتے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ جناب ممتاز حسن صاحب نے "جذبات نادر" کی تدوین میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہیں رکھا۔ نادر کاکوری زمانے کی ناقدر دانی کے ہاتھوں رفتہ رفتہ ہمارے ذہن و نظر سے اسقدر اوجھل ہوتے جا رہے تھے کہ ان کے متعلق ضروری معلومات بھی ہماری دسترس سے باہر ہو چلی تھیں، لیکن فاضل مقدمہ نگار نے پرانے رسائل کی فائلوں، بیاضوں کی چھان بین اور نادر کے احباب و اعزہ سے پوچھ گچھ کے بعد جو بیش بہا سوانحی اور تنقیدی مواد فراہم کر دیا ہے۔ وہ صد درجہ قابل ستائش ہے۔ نادر کی شخصیت و فن پر بھی عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ مقدمہ میں جدید اردو شاعری میں انکی قدر و قیمت کا بھی تعین کیا ہے۔ مثالوں کے ذریعہ نادر کے ترجموں کی اہمیت پر نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ایک زبان کی شاعری کو دوسری زبان میں منتقل کرنا کتنا مشکل کام ہے اور نادر کاکوروی اس مشکل سے کس طرح آسان گزر گئے ہیں مقدمہ کے علاوہ قافیہ، ردیف، وزن، صحت تلفظ، قدیم و جدید لہجہ اور قواعد و علم بیان کے سلسلہ کی بہت سی مفید باتیں حاشیہ میں درج کی گئی ہیں جو مقدمہ نگار کی وسعت مطالعہ اور دیدہ ریزی کا پتہ دیتی ہیں

افسوس ہے کہ جذبات نادر میں کچھ چیزیں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں مثلاً ان کی وہ تاریخی نظم جو "دلی دربار" کے عنوان سے ان کی وفات سے چند ماہ پیشتر دسمبر ۱۹۱۱ء کے "ادیب" میں چھپی تھی۔ شامل نہیں ہے۔ ۴۲ شعروں کی یہ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے :-

اے پرانی دلی، اے آثار دیرینہ شکوہ اے جوانوں، بادشاہوں، غازیوں کی یادگار

ایک غزل بھی جس کا مطلع درج ذیل ہے اور جو مئی ۱۹۱۱ء کے "تمدن" میں شائع ہوئی تھی۔ "جذبات نادر" میں شامل نہیں ہے :-

دل بھر آیا پچھلا سامان اسیری دیکھ کر رو دیا میں اپنا زندان خالی دیکھ کر

وہ قطعہ بھی نہیں ہے جس کا آخری شعر یہ ہے :-

فغان شب بھر جو میں تکلیف مجبوری سے کرتا ہوں
برا کرتا ہوں لیکن سخت مجبوری سے کرتا ہوں

امید ہے آئندہ ایڈیشن میں متروکہ کلام بھی شامل کر دیا جائے گا

ملنے کا پتہ :- ترقی اردو بورڈ، کراچی

اردوئے معلیٰ دہلی

(لسانیات نمبر) مرتبہ :- خواجہ احمد فاروقی ناشر :- شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی

حکومتوں کی عدم توجہ کے باوجود اردو کو اندرون ملک اور بیرون ملک سیاسی و سماجی ضرورتوں کی بنا پر جو قبول عام حاصل ہو رہا ہے وہ شاید اس سے پہلے اسے نصیب نہیں رہا۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں اور اسکی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ صرف جاپان کی یونیورسٹیوں میں تقریباً دو سو طلباء اردو پڑھ رہے ہیں۔ کم و بیش یہی حال دوسری جگہوں کا ہے خود پاکستانی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بیرونی طلباء اردو پڑھنے کی غرض سے خاصی تعداد میں آ رہے ہیں لیکن غیر ملکیوں کے لئے اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کا کوئی ایسا معیاری نصاب یا لائحہ عمل موجود نہیں ہے جس کے تحت انھیں باقاعدہ تعلیم دی جا سکے۔ باہر کی مختلف یونیورسٹیوں نے مقامی ضرورتوں کے تحت اپنا اپنا نصاب اور امتحان کا طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے ان نصابوں اور امتحانوں میں تطابق پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ جب یہ طلباء اپنے ملکوں سے پاکستان یا ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے لئے آئیں تو انہیں ایک خاص سطح پر آسانی سے لایا جا سکے۔ نصاب کی تدوین و ترتیب اور تدریس کی جانب بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ غیر ملکیوں اور لغوں کا نصاب اور تدریس کا طریقہ کار، ان طلباء کے نصاب سے مختلف ہونا چاہیے جن کی مادری زبان یا دوسری زبان اردو ہے۔ نہ صرف نصاب

بلکہ بیرونی طلبار کی ضرورتوں اور دشواریوں کو پیش نظر رکھ کر مختلف قسم کی علمی و ادبی کتابوں اور مضمونوں کی فراہمی کا انتظام بھی مناسب طور پر ہونا چاہیئے ورنہ اردو کو وہ مقام جلد حاصل نہ ہوسکے گا جس کے ہم سب خواہش مند ہیں۔

"اردوئے معلیٰ دہلی" نے "لسانیات نمبر" کے ذریعے انہیں مسائل کا حل تلاش کرنے کی سعی و ابتدا کی ہے۔ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ زبان اردو اور تدریس زبان اردو دونوں کے متعلق اس نمبر میں نہایت تحقیق و محنت سے اسی قسم کا مواد جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو بیرونی طلبار کی تعلیم و تدریس میں زیادہ سے زیادہ معاون ثابت ہوسکے۔ پہلے حصے میں اردو زبان کے خمیر و سرشت، اسباب پیدائش و پیدائش گاہ، ابتدا و ارتقار، صوتیاتی نظام و آہنگ اور ہند آریائی زبانوں کے باہم تعلقات کے مختلف موضوعات پر پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر محی الدین قادری، پروفیسر عبدالقادر سروری۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر گیان چند جیسے ماہرین زبان و ادب نے مقالے سپرد قلم کئے ہیں۔ اور موضوعات سے پورا انصاف کیا ہے۔ بعض الجھے ہوئے مسائل کو بھی اس حصے میں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے "اردو کی ابتدا" کے عنوان سے اس سلسلے کے سارے نظریات کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ اور مزید تحقیق و تلاش کی راہیں سجھائی ہیں۔

رسالے کا دوسرا حصہ "تعلیم زبان اردو" سے بحث کرتا ہے اس حصے کا پہلا مقالہ "تعلیم زبان کے چند اصول" مصنف رچرڈ ایچ۔ بنسن مترجمہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نہایت کارآمد ہے۔ اور غیر ملکیوں کو اردو سکھانے کی راہیں متعین کرتا ہے۔ دوسرے مقالے میں عبدالغفار مدھولوی نے اردو املا سکھانے کا ایک دلچسپ طریقہ تجویز کیا ہے لیکن یہ صرف ابتدائی اور سادے املا تک ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اور املا کی ساری ابتدائی دقتوں کو زیر بحث نہیں لاتا مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ کون سے حروف ملائے جائیں اور کون سے نہ ملائے جائیں۔ بلکہ اردو املا کا مسئلہ بعض حروف کے ان شوشوں سے تعلق رکھتا ہے جو کئی کئی صورتیں بدلتے ہیں۔ اور طلبار کو اکثر الجھن میں ڈال دیتے ہیں اس لئے بالغوں یا بیرونی طلبار کے لئے عبدالغفار مدھولوی کی تجویز کچھ زیادہ مفید نہیں ہے۔ املا کے سلسلے میں جملہ واری طریقے کو اپنانا چاہیئے اور حروف کے مسائل کو اردو کی ابتدا کرتے وقت نہ چھیڑنا چاہیئے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ میں نے اپنی نئی کتاب "تدریس اردو" مطبوعہ جامعہ تعلیم ملی کراچی میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے اور جملہ واری طریقہ کار کی سہولتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے "اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف یہ کہ عالمانہ چیز ہے۔ بلکہ اردو تعلیم و تدریس کے مسائل کو فی الواقع سلجھانے میں مدد دیتا ہے۔ نکہت جہاں کا مقالہ اگرچہ مختصر ہے۔ لیکن اس میں غیر ملکی طلبار کی اردو تعلیم کے معیار، طریقہ کار اور اصول کے مباحث کو چند صفحوں میں نہایت کامیابی سے سمیٹ دیا گیا ہے۔ آخری مضمون "اردو رسم خط میں علامتیں" نہایت مفید و دلچسپ ہے غرض کہ یہ نمبر اردو تعلیم و تدریس پر ایک نہایت وقیع تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ پرچہ تقریباً تین سو صفحوں میں نہایت اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ اور اس لحاظ سے اس کی قیمت پانچ روپیہ بہت مناسب ہے۔

عوارف المعارف

مصنف:۔ عمر بن محمد شہاب الدین سہروردی
مترجم:۔ سید رشید احمد ارشد، استاد شعبہ عربی کراچی یونیورسٹی
ناشر:۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

"عوارف المعارف" کا شمار ان بلند پایہ تصانیف میں ہوتا ہے کہ جو نہ صرف بلحاظ موضوع بلکہ اسلوب کی دلکشی اور انفرادیت کے اعتبار سے بھی عربی زبان میں نہایت اہم خیال کی جاتی ہیں۔ اس کتاب میں تصوف کے رموز و مکاشفات احوال و مقامات، تصرفات و اثرات، آداب و اشغال اور آغاز و ارتقار پر محققانہ و ناقدانہ انداز میں عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ تصوف کے جملہ مسائل و نکات کو تجزیہ و تحلیل اور تنقیح و تشریح کے ذریعے کچھ اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر کا تصور مشکل ہوجاتا ہے۔ آج کوئی شخص تصوف کے اثر و نفوذ کا قائل ہو یا نہ ہو لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ تصوف نے زندگی کی ایک منفی تحریک ہوتے ہوئے بھی ہماری زندگی پر بہت سے مثبت اثرات چھوڑے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کسی زمانے میں تصوف کو محض نظری فلسفہ حیات نہیں بلکہ زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ خیال کیا جاتا تھا۔ ایک ایسا طریقہ جو ظاہر سے زیادہ باطن اور مادی آسودگی سے زیادہ روحانی آسودگی پر زور دیتا تھا اس طرز زندگی

اور طریقِ فکر نے مشرق پر جتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ شاید کسی اور تحریک نے نہیں ڈالا۔ عبادت و ریاضت، معاشرت و تمدن، ملی تحریکات و ثقافتی کارنامے سب پر اس کے نقوش ثبت ہیں۔ اردو، ہندی اور عربی و فارسی، زبان و ادب پر تو اس کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ جب تک کوئی شخص تصوف کے رموز و علائم اور مسائل و لوازم سے کم و بیش واقف نہ ہو ان سے لطف اندوز ہو ہی نہیں سکتا۔ صوفی کی وجہ تسمیہ خواہ کچھ ہو اور مختلف عہدوں میں مختلف ضرورتوں سے اس نے خواہ کتنی ہی صورتیں اختیار کی ہوں لیکن بنیادی طور پر اس کی روح ہر عہد، ہر صورت اور ہر مقام پر ایک سی رہی ہے۔ یعنی اس نے ہمیشہ مظلوموں، جمہور پسندوں اور کمزوروں سے ہمدردی کا اظہار و اعلان کیا ہے اور عالمگیر انسانی برادری کے تصور کی حمایت کی ہے اور شاید اس لئے انسان نے اس کا اثر ہر عہد میں قبول کیا ہے۔

اردو میں بہت کم ایسی کتابیں ہیں جن میں علم تصوف پر جامعیت کیساتھ بحث کی گئی ہے۔ "عوارف المعارف" اس موضوع پر پہلی واضح اور جامع کتاب ہے جو اردو میں منتقل کی گئی ہے اس کا ترجمہ سب سے پہلے مولوی ابوالحسن نے کیا تھا جو ۱۸۹۱ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا تھا ۱۹۲۶ء میں اسے دوبارہ اسی مطبع سے شائع کیا گیا۔ اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ترجمہ بہ اعتبار معنوی اگرچہ ہر طرح جامع ہے لیکن خرابی یہ ہے کہ ان کا اسلوب طرز قدیم کا پابند ہے۔ پھر چونکہ مترجم نے لفظی ترجمہ کیا ہے اس لئے لفظی تعقید پیدا ہو گئی ہے اس تعقید لفظی نے کہیں کہیں فقروں کو گنجلک کر دیا ہے اور نفس مضمون کی تفہیم میں دقت پیش آتی ہے۔ بعض اصطلاحات اور ان کے ترجمے بھی ایسے موجود ہیں جو اردو میں متعین معنے نہیں دیتے۔ ان باتوں کا ترجمے پر یہ اثر ہوا ہے کہ عبارت کی روانی مجروح ہو گئی ہے اور شاید اسی لئے یہ ترجمہ عام اردو خواں طبقے تک نہیں پہنچ سکا۔ اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ علم تصوف کی اس جامع کتاب کا کوئی نہایت آسان، سادہ اور بامحاورہ آزاد اردو ترجمہ کیا جاتا تاکہ علم تصوف یا تصوف سے شغف — اور زبان اردو سے دلچسپی رکھنے والے دونوں اس سے استفادہ کر سکتے۔

یہ امر باعث مسرت ہے۔ رشید احمد ارشد استاد شعبہ عربی، کراچی یونیورسٹی نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اور ان کی توجہ سے اس بلند پایہ تصنیف کا ایک ایسا معیاری اردو ترجمہ منظر عام پر آگیا ہے جو اردو ترجموں کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مترجم نے ایک جامع مقدمہ بھی سپرد قلم کیا ہے اور کتاب کے مصنف کی زندگی و شخصیت کے متعلق مفید و ضروری معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

مخاطبات

از :- انجم فوقی بدایونی

انجم فوقی بدایونی شاعر کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کا شمار طرز قدیم کے پختہ گو شعراء میں ہوتا ہے لیکن اس بات سے شاید بہت کم لوگ واقف ہونگے کہ وہ محض قال کے انسان نہیں بلکہ طریقت و شریعت کی کوئی منزل ان کی دسترس سے باہر نہیں۔

زیر نظر کتاب ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جسے مخاطبات نہیں بلکہ حقیقی معنی میں ان کے مکاشفات کہنا چاہیئے۔ یہ خطوط تقریباً سو صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ظاہری و باطنی زندگی کا شاید کوئی پہلو ایسا ہو جو زیر بحث نہ آگیا ہو زبان و بیان پاکیزہ اور سادہ ہے۔ عام و خاص دونوں اس سے لطف لے سکتے ہیں۔

کتاب تین روپے میں جی۔ ۵۴۲ کورنگی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

برگ و بار

اردو کے کہنہ مشق شاعر برہم ناتھ دت قاصر کا مجموعۂ کلام ہے۔ قاصر اردو کے ان دیرینہ بہی خواہوں، پختہ کار ادیبوں اور ایثار پیشہ انسانوں میں ہیں۔ جنہوں نے ہمیشہ "با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا" کو تفسیر گیتی جانا ہے اور دیر و حرم کی حدود سے آگے بڑھ کر

انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے ؎

بشر کو چاہیئے آہستہ رو ہوائے قامر نہ مور کا بھی سرِ راہ دل دکھا کے چلے

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس پیغام محبت" اور "می تواں فارغ زبند کفر وایماں زلیستن" کا انعام انہیں کیا ملا یہ خود انکی زبانی سنیئے

"باپ پاکستان میں اس لئے مارا گیا کہ ہندو تھا اور امرتسر میں مرا گھر اس لئے لوٹا اور جلایا گیا کہ میں مسلم نواز تھا"

اس سے قامر کی شرافت نفس اور انسان دوستی کا اندازہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ میر نے شاعری کو "فن شریف" کہا تھا اور اس میں شک نہیں کہ جذبات کی لطافت اور خیالات کی پاکیزگی کے بغیر "چاند سورج تو ہاتھ آسکتے ہیں، شاعری ہاتھ نہیں آسکتی۔"

"برگ و بار" کی نظمیں اور غزلیں اسی شرافت نفس کی آئینہ دار ہیں اور ان میں سچائی، سادگی اور جذب و کشش کا وہی سامان موجود ہے جو شاعر کی شخصیت کا طرۂ امتیاز ہے۔ یوں تو قامر کی غزلیں اور نظمیں دونوں "مائدہ لذت درد" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور بقدر لب و دندان "ہر شخص ان سے اپنا کام نکال سکتا ہے لیکن ہمارے خیال میں "ذوق ادب کی تسکین" اور دل منت گداز کی سیرابی کا سامان بہ نسبت نظم کے غزل میں زیادہ ہے گو ان کی غزلوں کی نرمی، صداقت، شوخی و شیرینی، حسرت اور داغ کی یاد دلاتی ہے، لیکن انداز سخن گوئی میں انکی انفرادیت الگ نمایاں ہے۔ اس لئے آج نہ سہی تو کل لوگ انکی غزل گوئی کا محافظ و نمائندہ خیال کریں گے۔

اہل سیف

از:- برہم ناتھ دت قاصر

جیسا کہ نام سے مترشح ہے۔ اس کتاب میں دنیا کے سات نامور جنگجو حکمرانوں، سکندر اعظم، ہانی بال، جولیس سیزر، اٹیلا، چنگیز خاں، فریڈرک اعظم اور نپولین اعظم کے کارناموں اور سوانح حیات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو کے سوانحی اور تاریخی سرمایہ میں بڑا اچھا اضافہ ہے۔ اس لئے بھی کہ اردو میں اس نوع کی کتابیں بہت کم ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ اس میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ سرسری نہیں ہے بلکہ واقعات وحالات کی فراہمی میں تحقیق و تلاش اور دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ انداز بیان نہایت شگفتہ و سلیس ہے اور عام وخاص دونوں اس سے یکساں استفادہ کر سکتے ہیں۔

اس کتاب سے جہاں مصنف کی تاریخی بصیرت اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے مصنف عمر بھر "حکایت مہر و وفا" سناتے رہنے کے باوجود "قصہ سکندر و دارا" سے بھی بے خبر نہیں رہا۔

قامر کی یہ دونوں کتابیں "مکتبہ گلزار ادب" ۱۷ کرشنا مارکیٹ امرتسر سے مل سکتی ہیں۔

اقبال نمبر (سالنامہ سنہ ۱۹۶۲ء) جسے پاکستان کے معجز بیان شاعر اقبال کے نام نامی پر موسوم کیا گیا ہے اس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتداء اور مختلف ادوار شاعری اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف، اس کا آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت تین روپے

ادارہ ادب عالیہ۔ کراچی ۱۸

تصانیف نیاز فتحپوری

مذہبی استفسارات وجوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے اسکی فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۵) یونس و ہارون۔ (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت وماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور طرط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ،

ضخامت ۳۰۰ صفحات کاغذ دبیز قیمت :۔

چھ روپے پچھتر پیسے۔ علاوہ محصولڈاک

نگارستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا پہلا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی ومعاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ یک معجزہ ادب کی حیثیت رکھتاہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات کے ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت پانچ روپے،

(علاوہ محصولڈاک)

من ویزداں

مذہبی تفریق کو ختم کر دینے والی انجیل انسانیت مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف وصحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام بنی نوع انسان کو انسانیت کبریٰ اور اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونیکی دعوت دی گئی ہے اور مذاہب کی تحقیق ودینی عقائد ورسالت کے مفہوم اور کتب مقدسہ پر تاریخی وعلمی اخلاقی ونفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت :۔ آٹھ روپیہ (علاوہ محصولڈاک)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی ومعاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ، ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتاہے۔

اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور شامل کئے گئے ہیں۔ جو پہلے

★

ایڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت :

چھ روپے پچھتر پیسے

★ (علاوہ محصولڈاک)

مکتوبات نیاز (تین حصے)

ایڈیٹر نیاز کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں۔ اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں

قیمت ہر حصے کی ——— پانچ روپے

(علاوہ محصولڈاک)

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اسکی زبان، تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی انشائے عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔

قیمت :۔ دو روپے پچاس پیسے

(علاوہ محصولڈاک)

تاریخ کے گمشدہ اوراق

(حسن کی عیاریاں)

جسمیں تاریخی اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا۔ اور ان افسانوں کے مطالعے سے آپ پر واضح ہوگا

کہ تاریخ کے

بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ جن کو حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

★

قیمت :۔ دو روپے پچاس پیسے

(علاوہ محصولڈاک)

نظیر نمبر

(نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ) جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک۔ اس کا فارسی و اردو کلام میں عارفانہ رنگ، اس کی قدرت زبان و بیان، اس کا معیاری تغزل، ادبیات اردو میں اس کا فنی و لسانی درجہ، اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صناع و طباع شعراء کا فرق، معاصرین کی رائیں۔ مستند ادبا کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اس کی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قیمت تین روپے

ادارہ ادبِ عالیہ۔ کراچی ۱۸

واٹر چیریز کمپاؤنڈ

بشمول وٹامن بی کمپلیکس

صحت، قوت اور جسمانی نشو و نما کیلئے آپکو اسکی ضرورت ہے

ضروری حیاتین اور دیگر اہم اجزا کا متوازن مرکب
جو آپ کی دماغی اور جسمانی قوتوں کا معاون و محافظ ہے

ساختہ: ایسٹرن فارماسیوٹیکل لیبارٹریز لمیٹڈ کراچی پاکستان

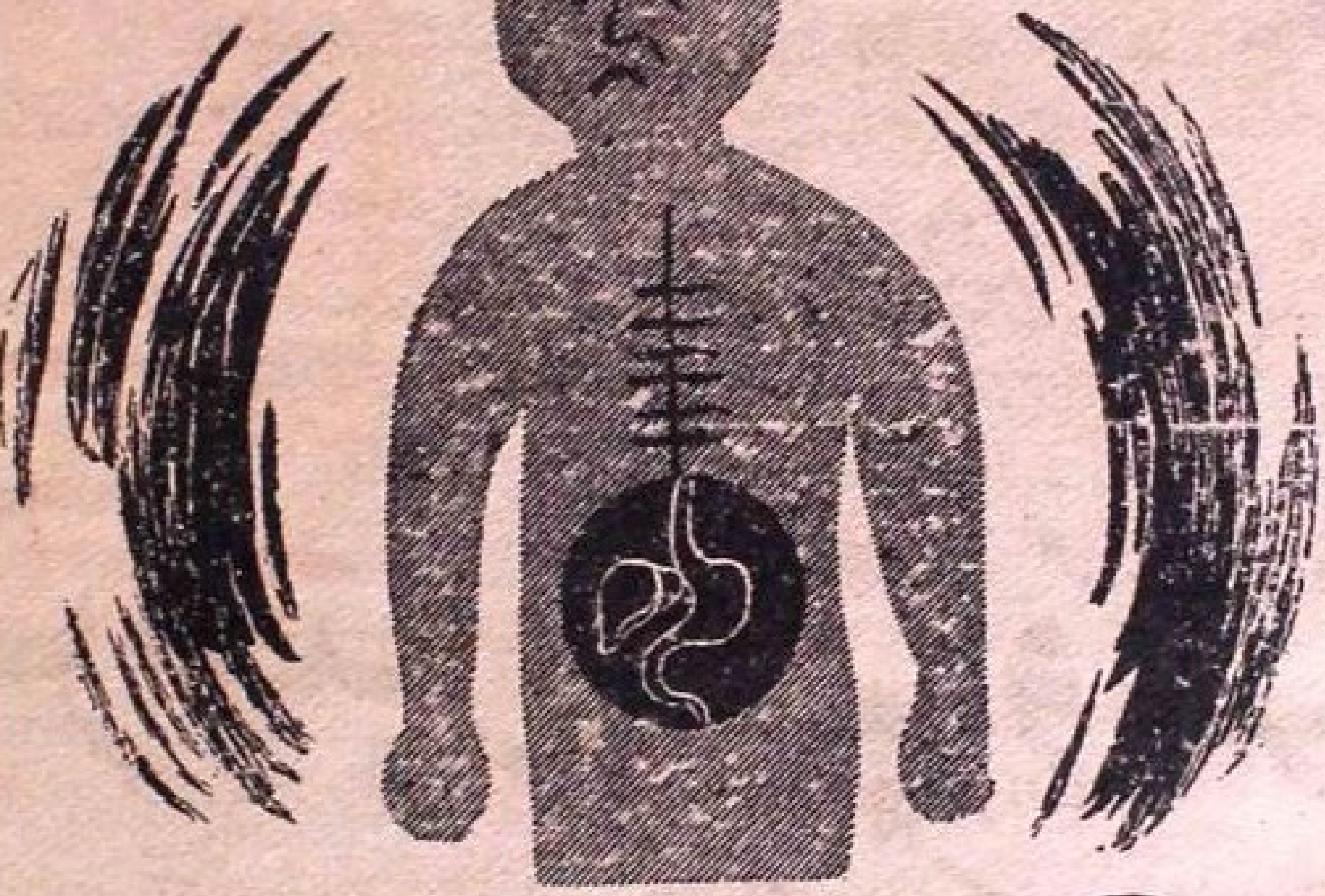

ہاضمہ خراب ہو تو صحت کیوں کر ٹھیک رہے!

معدہ، جگر اور آنتوں کے افعال صحیح نہ رہیں تو ہاضمہ بگڑ جاتا ہے اور صحیح و صالح خون بننا بند ہو جاتا ہے جس سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔ سستی، طبیعت کا گرا گرا رہنا، پژمردگی، چہرے کی زردی، منہ کا مزا بگڑ جانا اور قبض سب اس کی نشانیاں ہیں کہ آپکا ہضم خراب ہے۔ کارمینا ایسے حالات میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔

کارمینا نہ صرف معدہ، جگر اور آنتوں کو طاقت دیتی ہے بلکہ ان کے قدرتی افعال کو بحال کر دیتی ہے۔ آپ کچھ ہی کھائیں، کھانے کے بعد کارمینا کی ٹکیاں بہترین ہاضم کا کام دیتی ہیں۔ اس کے استعمال سے بدہضمی، قبض، بھوک کی کمی، پیٹ پھولنا اور سینے کی جلن جیسی تکلیفیں پیدا نہیں ہوتیں۔

کارمینا

معدہ اور جگر کے فعل کی اصلاح کرتی ہے

ہر کیمسٹ ڈرگسٹ اور جنرل اسٹور پر ملتا ہے۔

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ

H.C. 4/1113 united

اِس سلسلہ کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:-

(انشاؔ)	اب تو اگلی سی طرح کا نہیں گہرا پردہ	رہ گیا آپ میں اور ہم میں اکہرا پردہ
"	چھیڑنے کا تو مزا تب ہے کہو اور سنو	بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو
"	غیر کے مونڈھے پہ تم ہاتھ جو دھر بیٹھ گئے	ساتھ والوں کو نہ پوچھا کہ کدھر بیٹھ گئے
"	آئی تھی ایک حور مجھے دیکھ ہٹ گئی	دانتوں کے نیچے داب زباں جھٹ پلٹ گئی
(مصحفیؔ)	بھیگنے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا!	پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا
"	دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر	شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر
"	اک دن جھلک دکھا کر وہ مہ چلا گیا تھا	اب تک وہی سماں ہے غرفے کی جالیوں میں
	تری رفتار سے اک بے خبری نکلے ہے،	مست و مدہوش ہو جیسے کہ پری نکلے ہے
(جرأت)	کل تم نہ تھے تو رات تھی پیارے بلا طویل	اب ہو تو دیکھ لیجو دم میں سحر ہے آج
"	نہ دیکھا جو نصیبوں میں ہے تو وصل میں بھی	اٹھا کے آنکھ نہیں دیکھتے حجاب سے ہم
(جرأت)	ہے وقت جوشِ اشکوں کا کیا لطف ہو گر یہیں	دل جن کے مل رہے ہیں ہیں وہ پاس پاس گھر ہیں
(آتشؔ)	گلوں نے کپڑے پھاڑے ہیں قبائے یار پر کیا کیا	حنا لپس لپس گئی ہے دستِ رنگینِ یار پر کیا کیا
"	شباب تک نہیں پہنچا ہے عالمِ طفلی	ہنوز حسنِ جوانی یار راہ میں ہے
"	جس کو کہتے ہیں چودھویں کا چاند	تری تصویر ہے جوانی کی!
ناسخؔ	نہ دے اے جوشِ بدمستی بہت ترغیبِ گستاخی	خجالت یار سے ہو گی کبھی تو ہوش آنا ہے
"	وہ کہہ گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے	تمام رات چراغوں سے اپنے داغ جلے
(سید محمد آزاد)	اٹھا ہے پردہ فقط اک نقاب باقی ہے	ابھی مزاج میں کچھ کچھ حجاب باقی ہے
"	بیان کیجئے کیا واردات اتنی ہے	وہ بولتے نہیں کچھ منہ سے بات اتنی ہے
(امداد علی بحرؔ)	میرا مہمان ہے اک رشکِ قمر آج کی رات	منزلِ ماہ نظر آتا ہے گھر آج کی رات
"	میں دوڑ رہا ہوں اس کے پیچھے	سائے سے جو اپنے بھاگتا ہے!
"	سیرت کسی کی خوب ہے صورت کسی کی خوب	کوئی ہمارے دل میں ہے کوئی نظر میں ہے
(علی اوسط رشکؔ)	اقرار کا یقین نہ انکار کا یقیں	تری زباں پہ ہے ادھر ہاں ادھر نہیں
"	میں ایک بات کے رکھتا ہوں دل میں لاکھ جواب	وہ ایک بات میں کرتا ہے لاجواب مجھے
"	ملال راہ اٹھانے کو کون کہتا ہے	مجھے بلا تجھے آنے کو کون کہتا ہے!
(آغا حجو شرفؔ)	شاخِ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی	پھر گیا آنکھوں میں نقشہ تری انگڑائی کا
(دیا شنکر نسیمؔ)	عکسِ آئینہ کس کے دھیان میں ہو	رخ ادھر کیوں ہے دل ادھر کیوں ہے
"	جو دن کو نکلو تو خورشید گرد سر گھومے	چلو جو شب کو تو قدموں پہ ماہتاب گرے
(عنایت علی ماہؔ)	چھپتے ہیں چھپائے سے کہیں پیار کے تیور	صورت کو بنا دیتی ہے الفت کی نظر اور

(وزیر علی صبا) — اللہ رے ان کا غصہ اتنا نہیں سمجھتے ۔ کیوں کر کوئی جئے گا جب یہ عتاب ہوگا

(خواجہ وزیر) — ہے سرمہ کا دنبالہ تری آنکھ میں ساقی ۔ ساغر سے ترے موج یہ باہر تو نہیں ہے

" — آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے ۔ فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

(دوست علی خلیل) — آئینہ لے کے جو اس رشکِ چمن نے دیکھا ۔ اک چمن اور ہوا عکسِ چمن سے پیدا

" — اللہ ری شرمِ یار جو اُلٹا نقاب بھی ۔ منہ سے نہ ہاتھ وصل کی شب تا سحر اُٹھا

(محمد رضا برق) — چاندنی کھل گئی دالان کا جو پردہ اٹھا ۔ سو کے جب صبح کو وہ چاند کا ٹکڑا اٹھا

" — جسمِ لطیفِ یار میں خوشبو دلہن کی ہے ۔ گل سے کہیں زیادہ کلی پیرہن کی ہے

(واجد علی شاہ اختر) — پسند آگیا اس بادہ خوار کا اسلوب ۔ وہ اس کی نشے کی آنکھیں خمار کا اسلوب

" — جمالِ یار کو سارا بدن ترستا ہے ۔ ہر ایک داغ نے تن پر بصارتیں پائیں

(امان علی سحر) — پاس آ بیٹھے تو دل اٹھ گیا اک عالم سے ۔ اب جو اٹھ جاؤ گے اے رشکِ قمر کیا ہوگا

(مظفر علی اسیر) — کب ماہِ چاردہ کی طرف دیکھتے ہیں وہ ۔ جن کو تمہاری چاند سی صورت پسند ہے

" — پری جواب پری کا جواب ہے حور! ۔ تمہیں کہو کہ تمہارا بھی ہے جواب کہیں

یہ احساس جمال صرف جلوہ پرستی تک ہی محدود نہ رہا بلکہ بعض شعراء نشاطِ طبع کی خاطر جلوہ پرستی سے بڑھ کر جنس کشش و لذتِ لمس اور تمنائے وصال کا ذکر کرنے لگے۔ اور لکھنؤ کی عشقیہ شاعری کی کوئی صنف ان باتوں سے خالی نہ رہی۔ یہاں مثنویوں اور واسوختوں میں عموماً شعراء نے اختلاط کے مواقع دکھلائے ہیں لیکن بہ لحاظ انفرادی ذوق کسی نے یہ باتیں استعارات میں بیان کی ہیں۔ اور کسی نے ان کے اظہار میں اتنا غلو برتا ہے کہ جنسی اشتعال کا احتمال ہوتا ہے مثلاً دیا شنکر نسیم اور نواب مرزا شوق ایک ہی اُستاد کے دو شاگرد ہیں۔ لیکن دونوں میں اتنا فرق ہے کہ نسیم اختلاط کے مواقع پر اپنا مفہوم استعارات میں چھپا کر اس طرح بیان کرتے ہیں۔

بے پردگی ہوتی تھی جو ان میں ۔ دروازوں نے بند کر لیں آنکھیں

طومار حجاب کو کیا طے ۔ ساغر پہ جھکا وہ شیشۂ مے

لیکن اسی بات کو مرزا شوق فریبِ عشق اور بہارِ عشق میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو خود مصنف کی لذت کشی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ نسیم کے بیان میں قدیم داستانوں کا سا انداز ہے۔ چنانچہ میر امن کی باغ و بہار میں بھی اختلاط کے موقع پر ایسے ہی استعارات استعمال کئے گئے ہیں۔ اور پنجابی زبان کے شاعر وارث شاہ کی ہیر میں بھی اتنی اشعار میں ایسی ہی باتیں عجیب عجیب استعارات میں بیان ہوئی ہیں۔ لیکن میر اثر، مرزا شوق اور حکیم مومن خاں زیادہ بے حجاب نظر آتے ہیں۔

لکھنؤ کی غزلوں میں جسم کی لمسیاتی کیفیت سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ لیکن مصحفی، آتش، ناسخ اور ان کے بعض تلامذہ نے جنسی جذبات کی گرمی اور شوخی کم پسند کی ہے۔ انشاء، جرات، رند اور مرزا شوق کے یہاں جنسی دلچسپی کا سبب ان کی زندگی اور شخصیت کے مطالعے سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی کسی حد تک غور طلب ہے۔ کہ وہ کون سی سوسائٹی تھی جس کی دلچسپی کے لئے اس طرح کے اشعار کہے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب امیرزادے چودہ پندرہ سال کی عمر میں طوائف سے علم مجلسی سیکھ کر نکلیں گے اور اپنے اردگرد حسنِ نسوانی کی افراط پائیں گے۔ تو ان کی میرزا منشی بہت جلد انہیں جنسی تجربات سے آشنا کر دیگی۔ بلوغ کے آغاز کا زمانہ شہوانی جذبے کے انتہائی عروج کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس لئے امراء اودھ کی سوسائٹی میں پندرہ سولہ سال کے شہزادے اور امیرزادے عام طور پر بہت سے جنسی تجربات سے آشنا ہو جاتے تھے۔ میر حسن نے اسی لئے بے نظیر کی عمر پندرہ سولہ سال رکھی ہے، اور نجم النساء کو بھی چودہ سال سے زائد نہیں دکھایا۔ مرزا شوق بھی اسی سن و سال پر کمالِ خلیق"

بہ کردار کے کچے پن کا اظہار کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرد اپنی شدت جوانی کی لذتیں تیس سال سے قبل حاصل کر چکتے تھے۔ اور طوائف بھی بیس بائیس سال تک اپنی جنسی کشش کے دور سے گذر جاتی تھی۔ اس کے بعد ذہنی عیاشی کا زمانہ آجاتا تھا۔ واجد علی شاہ کی خود نوشت روئیداد "تاریخ پری خانہ" اس بات کا ثبوت ہے کہ انکی جوانی کا ابال گیارہ سال سے تیس سال تک رہا۔ اس کے بعد انکی جنسی محبت کی رفتار اعتدال پر آگئی۔ آغاز شباب میں انہوں نے پری خانے بنوائے۔ مینا بازار لگائے اور دنیا بھر کی حسین عورتوں کو اپنے دربار ولی عہدی میں جمع کیا۔ لیکن جوانی کے ڈھلتے ہی پردہ قید فرنگ میں محبوبہ کی کھلی ہوئی زلفوں، ترشے ہوئے ناخنوں، رضائی کی خوشبو اور مستی سے لذت لینے لگے تھے اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی شاعری میں ماحول کے اثر سے کہیں زیادہ خود شعراء کا ذاتی میلان طبع بھی کارفرما رہا۔ اور انہیں رجحانات نے سید انشاء، جرأت رند۔ اور مرزا شوق سے اس طرح کے شعر کہلائے

(انشاء) مجھ سے لپٹ کے آخر شب یار نے کہا — کیا جانے ان دنوں کی یہ کیوں رات گھٹ گئی

〃 یہ کس سے چاندنی میں ہم بزیر آسمان لیٹے — کہ باہم عرش پر مارے خوشی کے قدسیاں لیٹے

(جرأت) کن تمرقوں سے دیکھتے ہیں ہم وڑے وڑے — وہ ابھری ابھری گات وہ بازو بھرے بھرے

〃 بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کثرت شوق — آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھیے

رند گلے لگائیں بلائیں لیں تم کو پیار کریں — جو بات مانو تو منت ہزار بار کریں

(مرزا شوق) اک شب میرے گھر میں آن کے مہماں رہے تھے — آئے نہیں اس شرم کے مارے کئی دن سے

〃 منہ گال پر رکھ دیتے ہیں سوتے میں جھپٹ کر — کچھ کچھ تو حیا کم ہوئی یا لیے کئی دن سے

یہاں تک ہم نے لکھنؤ کے معتقدات، مقامی روایات اور تصور عشق کی روشنی میں ان کی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ لیکن بعد کو مذہب کے اثر اور علمیت کی متانت نے یہاں کے ادب کو بھی متاثر کیا۔ اور اس طرح لکھنؤ کی شاعری میں کافی اعتدال پیدا کر دیا۔ چنانچہ خلیق، انیس، مونس، دبیر، تعشق، عشق، نفیس، اوج رشید، مہدی حسین، ماہر۔ علی میاں کامل علی محمد عارف اور بندہ کاظم جاوید وغیرہ کے تغزل میں بھی کوئی شعر ایسا نہیں ملتا جس پر عریانی کا اطلاق ہو سکے۔ لکھنؤ کے شاہی عہد میں بیک وقت ہمیں شاعروں اور ادیبوں کے دو علیحدہ علیحدہ حلقے نظر آتے ہیں۔ ایک حلقہ وہ جسے مذہب والوں نے گوارا کیا۔ اور دوسرا وہ جسے انہوں نے پسند نہیں کیا۔ خلیق نے جب انیس کو مشورہ دیا تھا۔ کہ غزل کو سلام کی صورت میں لکھو۔ تو اس میں یہی بات چھپی ہوئی تھی کہ لکھنؤ میں اس وقت شعر و سخن کے دو واضح راستے کھلے ہوئے ہیں جس میں ایک بازاری عشق و محبت کا راستہ ہے۔ دوسرا حب اہل بیت اور ولائے آئمہ کا اور دونوں کے موضوعات ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ایک کے جذبات و خیالات میں ہوس کا دور دورہ ہے۔ اور دوسرے میں متانت و وقار کا ہے۔ ادھر کا آدمی ادھر جائے گا تو اسے اپنا ذہن، ضمیر و خمیر اور لب و لہجہ بالکل بدلنا پڑے گا۔ مرزا تقی ہوس جب مرثیہ کہیں گے۔ تو نہ صرف یہ کہ ان کے موضوعات اور مباحث بالکل بدل جائیں گے بلکہ یہ بھی کہ انہیں اپنا تخلص ہوس کے بجائے رضا رکھنا ہوگا۔ جعفر لال طرب جب غزل گوئی سے تائب ہو کر مرثیہ نگاروں میں شامل ہوں گے۔ تو ان کا تخلص دلگیر ہو جائے گا۔

غرض ان دونوں ادبی حلقوں نے ایک دوسرے کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش کی۔ اس سے یہ ہوا کہ ابتدائی ادوار کے غزل گو شعراء کو اپنی شوخی و بے باکی کے ساتھ اکثر اپنے مذہبی خلوص کے اظہار کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اس کے بعد پھر رفتہ رفتہ غزل سے جنسی اشتعال کا عنصر کم ہونے لگا۔ اس لئے ہم محسوس کرتے ہیں کہ لکھنؤ میں مخرب اخلاق شاعری کا زوال بڑی حد تک مرثیہ کے فروغ سے وابستہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کا مرثیہ خود بھی مجلسی آداب سے اثر قبول کرنے میں غزل سے متاثر ہوا۔ لیکن اس نے رچے ہوئے عشق کی محض تیغن باتوں ہی کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ یہ اثرات تلوار اور گھوڑے کی تعریفوں، چہرے اور شاعرانہ تعلی کے موقعوں سراپا اور مناظر قدرت کے بعض بیانات میں محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ آخر انیس کا یہ شعر بھی مرثیہ ہی میں موجود ہے۔

ذکر گل تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے — معشوق کو تلوار کی دھاروں میں نہ بھولے

خیر یہ بات تو حدود مرثیہ سے متعلق ہے، لیکن چند مرثیہ گویوں نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ جن میں ارضی محبت اور ارضی محبوب کے تصور کے باوصف ایک پر وقار گداز اور خلوص کا احساس ملتا ہے۔ اسی سلسلے میں میر ضمیر، تعشق اور پیارے صاحب رشید کی متغزلانہ شاعری خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اگرچہ مداح اہل بیت ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے اس سرمایہ کے وجود پر شرم آتی تھی۔ اور اسی جذبے کے تحت تعشق نے سفر حجاز کے وقت اپنا تمام سرمایۂ غزلیات سمندر کی نذر کر دیا تھا۔ اور پیارے صاحب رشید نے بھی اپنے وُرثا، کو یہی وصیت کر دی تھی۔ کہ ان کا دیوان غزلیات طبع نہ کرایا جائے حالانکہ جو غزلیں ان بزرگوں کی منظر عام پر آئیں وہ جنسی جذبات کے باوجود متانت کی آئینہ دار ہیں۔ اور ایک صحت مند عشق کا پتہ دیتی ہیں۔ میر ضمیر نے مرثیہ گوئی شروع کرنے سے قبل عین عالم شباب میں جو غزلیں کہی ہیں۔ ان کی متانت کا نمونہ یہ ہے۔

دیکھا جو میرا بستر جو کل اس شوخ نے خالی — ہر چند کیا ضبط مگر آنکھ بھر آئی!
آتے ہی ترے آگئی اک جان سی تن میں — اے نکہتِ گیسوئے معنبر کدھر آئی
پوچھو تو ضمیر جگر افگار کہاں ہے — جس دن سے گیا وہ نہ پھر اس کی خبر آئی

شیخ ناسخ کے شاگرد سید میرزا تعشق کا قدم ان سے بھی آگے ہے۔ اور وہ خلوص جذبات کی وجہ سے لکھنؤ کے میر سمجھے گئے، کم از کم عزیز لکھنوی نے تو یہی دعویٰ کیا ہے۔ تعشق کی ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

ہے یقیں باہم گلے ملنے کو اٹھیں دستِ شوق — ہو اگر تصویر بھی یکجا ہماری آپ کی
یاد ایام کہ تھا زوروں پہ جذب حسن و شوق — وہ مرے دل کا تڑپنا بیقراری آپکی
آج کس پر رحم آیا کس کو روتے ہیں حضور — ہے نصیب دشمنان آواز بھاری آپکی
عہد میں مجنوں کے لیلیٰ کا رہا کیا دور دور — اب تعشق کے زمانے میں ہے باری آپکی

غرض مذہب کے اثر نے یہاں کے تغزل میں اعتدال پیدا کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی زبان اور انداز بیان کو بھی سنوارا۔ مذہب کے اثر سے یہاں جو علمیت آئی اس نے لسانی اصلاح کی تحریک کو سہارا دیا۔ (اس موضوع پر ہم آگے چل کر تفصیل سے لکھیں گے)۔

لکھنؤ اگرچہ برہان الملک اور صفدر جنگ کا بھی دار الحکومت رہ چکا تھا۔ اور شجاع الدولہ نے بھی اپنے ابتدائی دور میں یہیں سکونت اختیار کی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آصف الدولہ سے قبل اس کی تعمیر و آرائش پر بہت کم توجہ ہوئی تھی۔ آصف الدولہ وہ پہلا حکمران ہے۔ جس کے عہد سے اس شہر کے تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی فروغ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور پھر سعادت علی خان سے واجد علی شاہ تک ہر فرمانروا نے اپنی ضرورت، مذاق اور معیار کے مطابق اس کی رونق میں اضافہ کرتے رہے۔ جس کی تصدیق شعراء کے کلام سے بھی ہوتی۔ میر حسن کے ابتدائی تاثرات یہ تھے۔

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں — نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں

اور آصف الدولہ کی توجہ کے بعد ان کی رائے اس طرح بدل گئی تھی۔

رہے نت آصف الدولہ سلامت — کہ جس نے کی یہاں طرح اقامت
عمارت کی یہاں وہ اس نے بنیاد — کہ نظارے سے دل ہو خلق کا شاد

اس شہر کے متعلق مصحفی نے فرمایا تھا کہ۔

کیا اور مصحفی میں کروں وصفِ لکھنؤ — روئے زمیں پہ اب یہ صفاہان ہے دوسرا
کیوں لکھنؤ نہ ثانی طہران ہو مصحفی — ملتی ہے گفتگو تری شاپور سے بہت

جرأت نے کہا تھا کہ۔

تمہارے جلوے سے رشکِ جناں ہوا یہ دیار — جو شش جہت میں نہیں ہے، سو لکھنؤ میں ہے

انشار کے تاثرات یہ تھے۔

نام خدا یہ شہر بہشت زمانہ ہے — ہیں لاکھوں اس میں پھول کی صورت کے سرو قد

دوسرے شعراء کے تاثرات ملاحظہ ہوں:۔

(ناسخ) تو نے دیکھے ہیں کہاں رنگین ادائے لکھنؤ — لالہ و گل کے چمن ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

(رند) رند کھل جاتا ہے یاں لکھوڑے گھر سے کمار پڑو — لکھنؤ اہل ہنر کے لیے ٹکسال ہے کج

(انیس) ہر دل ہے عندلیب گلستان لکھنؤ — رضواں بھی ہے جہاں میں ثنا خوان لکھنؤ

(برق) گہرافشاں ہے نیسان کرم سلطان عالم کا — بہار آئی جوانان چمن کی لکھنؤ چمکا

(اسیر) منتخب ہیں منتخب ہے ذات تری اے اسیر — لکھنؤ ہے جان عالم تو ہے جان لکھنؤ

(امیر مینائی) کہاں ہونگی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں — رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

(منیر) منیر اس شہر میں اوج کمال نظم پہنچا ہے — الٰہی لکھنؤ بھی عرش ہے مضمون عالی کا

مثنویوں میں بھی اس شہر کی آراستگی کے بہت سے روپ نظر آتے ہیں۔ بعض نے تو وزیر علی صبا کی طرح براہ راست اس کی تعریف کی ہے۔

مرقع سا اس شہر کا رنگ ہے — ہر اک نقش پا نقش ارژنگ ہے

جدھر دیکھو دیوار و در آئینہ — صفا میں ہے آئینہ ہر آئینہ

ہر اک نخل یاں کا ثمر ریز ہے — رعیت ہے خوش شہر زر ریز ہے

ہمیشہ ہیں بلبلیں خوش ہے سدا — کوئی نام غم سے نہیں آشنا

کریں سیر عاشق جو بازار کی — رہے سدھ نہ پھر کوچہ یار کی

جو سیر کی گل رخوں کا مقام — ہزاروں یہاں سرو قد خوش خرام

جدھر سنیئے آواز چنگ و رباب — جدھر دیکھیے دور جام شراب

اور کچھ شعراء نے اختر نگر یا حسن آباد کے فرضی نام کے پردے میں، اس شہر کی مبالغہ آمیز تخیلی یا جذباتی تصویریں پیش کی ہیں۔ فسانہ عجائب کے دیباچہ میں رجب علی بیگ سرور کا نثری بیان نگاری کی کوشش کے باوجود اسی قبیل کی چیز ہے۔ سرشار کے فسانہ آزاد میں لکھنؤ اگرچہ شاہی دور سے آگے بڑھ گیا تھا لیکن اسکی تصویروں میں بھی وہی ہنگامے۔ وہی تہواروں کے جلوس، میلوں کی بھیڑ بھاڑ۔ زرق برق لباس پہنے ہوئے امراء، حسین عورتیں، دعائیں دیتے ہوئے فقراء، اوچی بنے ہوئے بانکے نظر آتے ہیں۔ جو شاہی عہد کے تمدن کا ورثہ تھے۔ اودھ میں جشن و جلوس، میلوں، اور تہواروں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ اس لئے ان ہنگاموں کی تصویروں کو وہاں کے ادب میں بھی جگہ مل گئی اور لکھنؤ کی غزلیات کے بعض اشعار میں ان نشاط آفریں سرگرمیوں کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔

(انشار) چھبن، اکڑ، چھب، نگاہ، سج دھج، جمال طرز خرام آٹھوں"

"نہ ہو دیں اس بت کے گر پجاری تو کیوں ہو میلے کا نام آٹھوں"

(جرأت) آٹھ آٹھ آنسو نہ اب کیونکر پڑے روئیں ہم — چھوڑ تنہا ہمیں آٹھوں کے چلے میلے تم

(رند) میلہ ہے چاند گنج میں سورج گہن کا آج — تم کس لئے نہ غیرت شمس و قمر گئے

(برق) پھر وہی باغ کی سیریں ہوں وہی دھوم میں ہوں — پھر اٹھے قبلہ کی جانب سے گھٹا ساون کی

(سحر) سب کو اپنے رنگ پر کھینچا ہے قیصر باغ میں — گیروا ہر ایک کا جوڑا ہے قیصر باغ میں

(۱) اسیتمی کو راجہ ٹکیٹ رائے کے تالاب پر یہ میلہ بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ اسے لکھنؤ کی معاشرتی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔

(سحر) مبارک ہو کیا جشنِ شاہانہ ہے! "فرح بخش" کوٹھی پری خانہ ہے!

(اسیر) پڑوسی شاہ جہاں کی ہم کو لازم ہے اسیر "دلکشا"[1] میں دیکھیے چل کر فضا برسات کی

لکھنؤ کے ان ہنگاموں کا کچھ تصور آخری تاجدار کی شخصیت اور معمولات کے مطالعہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے باب تاریخ میں جو حقائق بیان کیے ہیں ان کی روشنی میں اگر طرزِ بیان کے تکلفات کو ہٹا کر یہ شاعرانہ بیان دیکھا جائے تو بہت سی باتوں کی توثیق ہو جائے گی۔ امان علی سحر واجد علی شاہ کی توصیف میں لکھتے ہیں۔

سلامت رہے شاہ بیدار بخت! حقیقت میں ہے رونقِ تاج و تخت
مقر ہے عدالت کا سارا جہاں! مٹا ہی دیا نام نوشیرواں
خوشامد سے یہ عرض کرتا نہیں! سکندر کو دارا کا رتبہ نہیں
یہ سیرت یہ صورت یہ محفل کہاں خزانہ ہوا بھی تو یہ دل کہاں
عجب طرح کے ولولے دل میں ہیں! کہ جب دیکھیے عشقِ علی منزل میں ہیں
کہوں زلفِ مشکیں کو شامِ اودھ تسلسل سے ہے انتظامِ اودھ
ختن کوئی حلقہ ہے کوئی تتار ہوا لکھنؤ کی ہے اب مشک بار
بدل ہیں جو حضرت غلامِ علی وظیفہ ہے دن رات نامِ علی
زبانِ مبارک پہ ہے یہ سخن! دمِ عیسوی ہے دمِ پنجتن
ادا دل سے کرتے ہیں فرضِ خدا کہ ہوتی نہیں پنج گانہ قضا
خدا موں کو یہ حکم حضرت کا ہے! کہ وقتِ سحر وقت غفلت کا ہے
اگر استراحت میں پاؤ مجھے! تو پانی چھڑک کر جگاؤ مجھے
اسی طرح ہے مجتہد کو ثبات اسی طرح پاتے ہیں خمس و زکات
خطاب[2] ایسے ایسے دیئے چھانٹ کر کہ گم نام بھی ہو گئے نامور
دیئے سب کو چاندی کے وہ تان جان ہوئی جن سے دونی سواری کی شان
تکلف یہ اس سن میں پیدا کیا کہ ہر فن میں ایجاد اپنا کیا!
یہ عالم جو پریوں کے عالم کا ہے سب ایجاد سلطانِ عالم کا ہے
مکاں ایسے ایسے بنائے کہ واہ پھسلتی ہے دیوار و در پر نگاہ
سواری کا "بادِ بہاری" ہے نام گذر ہے جلو خانے میں صبح و شام
ختن کے ہرن دلکشا میں جو آئیں سڑک دیکھ کر چوکڑی بھول جائیں
ملازم نئے ہوتے جاتے ہیں لوگ کہ رستوں سے چن چن کے آتے ہیں لوگ
کبھی سو جو بانکا اکٹھا ہوا وہ "تیار" ترچھا دو سالا ہوا
قواعد نئی اور بولی الگ جمی ایک جا ٹولی ٹولی الگ
عجب کام کرتے ہیں پھرتی کے ساتھ قواعد میں رہ جائیں گدوں کے ہاتھ
سواروں کے ہر سو پرے کے پرے وہ گھوڑے کہ انسان دیکھا کرے

(۱)۔ واجد علی شاہ کی ایک کوٹھی کا نام جو رقص و موسیقی کی تربیت کیلئے استعمال ہوتی تھی (۲) "بنی" میں ان خطابات کی پوری تفصیل درج ہے۔

عجب دَم ہے دُنیا میں یہ دم رہے — یہی دَور سلطان عالم رہے!

بادشاہ کی شکل آپ نے دیکھی۔ اب یہاں کے باشندوں کی افتادِ مزاج اور سوسائٹی کی خصوصیات کا بیان بھی اشعار ہی میں دیکھئے۔

عجب شہر ہے کچھ عجب لوگ ہیں — بہت ہیں مگر منتخب لوگ ہیں
کمالات میں فرد ہر ماہرو! — پسینوں میں عطرِ محبت کی بو
بڑے بامروت بڑے وضعدار — کریں جان تک آشنا پر نثار!
بڑے بانکے، مضبوط دل کے کرّے — غرض ایک سے سارے چھوٹے بڑے
مروت کے پتلے محبت کے لوگ — حقیقت میں قابل زیارت کے لوگ
نفیس ان کی پوشاک صورت نفیس — طبیعت نفیس اور صحبت نفیس
نیا روز مزہ نئی گفتگو! — ہمیشہ نئی بات کی جستجو!
جسے دیکھو ہشاش بشاش ہے — غرض یہ کہ ہر ایک خوش باش ہے
جہاں قدر موزوں کا ہے ہمتلا — نہیں فکر شعر وسخن کے سوا
نہ عقبےٰ کا کچھ غم نہ فکر معاش — شب و روز معشوق نو کی تلاش
نئی صحبتیں روز جلسے نئے! — اُٹھے لطف ہر ہر غزل سے نئے
جلاتے ہیں پریوں کو واسوخت سے — کہیں گھنتے ہیں فقط سوخت سے
کوئی سوز پڑھ کر رُلا دیتا ہے — کوئی منہ بنا کر ہنسا دیتا ہے
حقیقت میں یہ لوگ پیدا کہاں — نئے روز فقرے نئی گرمیاں!
پھٹکتا نہیں رنج الیوں کے پاس — کبھی جز محرم نہ دیکھا اُداس
یہ سب یوں تو ہر فن کے مشتاق ہیں — خصوصاً فن عشق میں طاق ہیں

ان اشعار میں شاعر نے یہاں کے لوگوں کی مروت، محبت وضعداری، بانکپن، نفاست، خوشی باشی، شعروسخن کے ذوق، حسن ومحبت کی دلچسپی اور حسینوں کے کمالات کی توصیف کی ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو عام طور پر یہاں کے کلچر کا نمایاں پہلو رہی ہیں۔ یہاں تہذیبِ نفس کا ایک خاص تصور ملتا ہے۔ اور اس تصور کے خصائص یہاں کے مرثیوں، مثنویوں، داستانوں، اور غزلوں کے بعض اشعار میں بھی ملتے ہیں۔ مثلاً میر حسن جب بینظیر کے متعلق کہتے ہیں۔

سوا ان کمالوں کے کتنے کمال — مروّت کی خو آدمیت کی چال
رذیلوں سے نفروں سے نفرت اسے — سدا قابلوں سے تھی صحبت اسے

تو گویا اودھ کے مثالی کردار کی وہ خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ جو یہاں کی سوسائٹی کو زیادہ عزیز تھیں۔ اسی طرح وضع کی پابندی، اٹھنے بیٹھنے کا خاص طریقہ، لباس کا حسن، تواضع، دردمندی، اور شیریں کلامی وغیرہ بہت سی ایسی باتیں ان کے معمولات میں داخل تھیں، جن کا اگر تجزیہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ ان لوگوں کو بغیر محنت کے دولت فراواں ملتی تھی۔ اس لئے انھوں نے اپنی شخصیت کی اہمیت بڑھانے کے لئے بعض ایسی باتیں اپنے اوپر لازم کرلی تھیں۔ جو عملی زندگی میں دشواریاں پیدا کرتی تھیں۔ مثلاً اسی وضع داری ہی کو لے لیجئے: لکھنؤ میں پاس وضع کو شرافت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ جب عملی زندگی اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ تو اس کی وجہ بڑی مضحکہ خیز صورتیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ مثلاً اگر کسی خاص تاریخ یا دن میں کسی دوست یا آشنا سے ملنے کا دستور قائم ہو چکا ہے۔ تو بلا ناغہ وہاں

جائیں گے۔ خواہ آندھی ہو یا پانی برس رہا ہو۔ بیمار ہیں تو پالکی میں جائیں گے۔ بستر مرگ پر ہیں تو یہ وصیت کریں گے۔ کہ جنازہ ادھر سے ہو کر جائے۔ کہتے ہیں۔ کہ میر انیس کو بھی اپنی وضع کا خاص خیال رہتا تھا۔ انھوں نے اپنی ملاقات کے وقت کا تعین کر رکھا تھا۔ اور اس وقت کے علاوہ کسی سے نہیں ملتے تھے۔ ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ امجد علی خاں نواب شیش محل، میر مونس کی عبادت کے لئے گئے تو انہوں نے سوچا کہ چلو واپسی میں میر انیس سے بھی ملتا چلوں وہاں پہنچے تو اندر سے جواب آیا کہ یہ وقت ملنے کا نہیں ہے۔ نواب صاحب کو مایوس لوٹنا پڑا۔ لیکن پاس وضع کے خیال سے انہیں کوئی ملال نہ ہوا۔ انیس ہی سے متعلق ایک اور روایت بھی مشہور ہے کہ ایک بار کوئی صاحب ان سے ملنے آئے۔ اتفاق سے ان کے گلے کا تکمہ کھلا رہ گیا۔ انیس اس ہیئت کو دیکھ کر مسکرائے۔ انھوں نے تبسم کا سبب دریافت کیا۔ تو میر انیس نے کہا۔ کہ اب شرفا بھی اس وضع سے نکلنے لگے۔ اس دن سے ان صاحب نے اپنی یہی وضع بنالی۔ اور پھر ساری عمر تکمہ نہ لگایا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وضع کی پابندی وبال جان ہو جاتی ہو گی۔ لیکن وہ اسے بہر حال نباہتے تھے۔ ان کے اس معاشرتی دستور کا احساس ان کے ادب سے بھی ہوتا ہے۔ جہاں وہ اپنی وضعداری کی اہمیت ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً۔

(اسیر) کیا شرافت ہے کبھی وضع نہ بدلی میں نے — پیرہن صورت گل جسم سے پھٹ کر اترا

(ظفر) اے جنوں ہم وضعداروں سے نہ گر گستاخیاں — کیا گریباں اپنا پھاڑیں شرم دامنگیر ہے

(رشک) وضعداری کا تقاضا نہیں رسوا ہونا — اے مرے رازِ غم عشق نہ افشا ہونا

یہاں کی زندگی اور ادب میں جو تصنع اور تکلف موجود ہے۔ اس کے ڈانڈے بھی ماحول کے انھیں تقاضوں سے جا ملتے ہیں۔ یہاں اطمینان، فراغت اور بےفکری تھی۔ اور زندگی کا کوئی بلند مقصد نگاہ کے سامنے نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ فکر سخن اور حصول محبوب دو ایسے کام تھے۔ جو انکی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے تھے۔ اس لئے ان کا زیادہ وقت ان جدتوں میں گذرتا تھا۔ جو انکی عمارات، پوشاک، غذا، حسن تکلم اور تفریحی مشاغل میں طرح طرح کی نزاکتیں پیدا کراتی ہیں۔ شعر و سخن سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ دولت، جوانی، اور عشق میں یہ چیزیں مزا دیتی ہیں۔ اس لئے انھوں نے شعراء کی بہت ہمت افزائی کی۔ ہندوستان بھر کے سخن گویوں کا ایک جم غفیر تھا۔ جو لکھنؤ کی طرف رواں دواں نظر آتا تھا۔ خود اس شہر میں بھی کثرت سے شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس طرح مقامی اور بیرونی شعراء کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی۔ ان میں کم و بیش سو مخصوص شعراء ایسے ہیں۔ جن کا ذکر اسپرنگر کے تذکرہ شعراء میں بھی ملتا ہے۔ ادب کی طرف اس خصوصی توجہ سے شاعری، شعراء اور شعر و سخن کے چرچوں کو سوسائٹی میں بلند درجہ دیدیا۔ اور اس طرح ادب شاعری کو کلچر بننے کا موقع نہیں ملا۔ صرف کلچر ہی نہیں فن بننے کا بھی۔ لیکن جہاں عیش و عشرت زندگی پر چھائے ہوئے ہوں۔ وہاں فن کو بھی ماحول کے تقاضہ کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔

فن کا تذکرہ آگیا ہے تو یہاں یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہیئے۔ کہ فن کے متعلق خود ان کا احساس کیا تھا عام طور پر ناقدین آتش کا صرف ایک شعر نقل کر کے "بندش الفاظ" ہی کو لکھنوی شاعری کا مقصد و منہاج سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ آتش نے اس سلسلے میں دو مسلسل شعر کہے تھے جن میں سے ایک نظر انداز کر دیا جاتا ہے ہم آتش کے دونوں شعر لکھ کر یہ غلط فہمی دور کئے دیتے ہیں۔ کہ وہ محض بندش الفاظ ہی کے قائل تھے۔ اشعار یہ ہیں :-

کھینچ دیتا ہے شبیہ شعر کا خاکہ خیال؛ — فکر رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرواز کا

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں — شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

ان دونوں اشعار میں پہلی بات یہ ہے کہ خیال شبیہ شعر کا خاکہ بناتا ہے۔ پھر اس میں فکر رنگیں جان ڈال کر پرواز کی طاقت دیتی ہے۔ یعنی جذبے کو صورت بخشتی ہے۔ اس کے بعد شاعر الفاظ کی میناکاری سے اپنی مرصع سازی کا کمال دکھاتا ہے۔ آتش نے اس مسلک ادب کی عمر بھر پابندی کی۔ ان کے یہاں عام طور پر تصویر سازی کا رجحان ملتا ہے۔ صرف رجحان ہی نہیں بلکہ اس پر اعتماد بھی۔ ؎

ہمارا شعر ہر اک عالم تصویر رکھتا ہے — مرقع جان کر ذی فہم دیوان مول لیتے ہیں

یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصور پیشہ ہیں کوئی — نئے نقشے نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں

لیکن انکی مصوری کا بیشتر حصہ واردات اور معاملات حسن و عشق تک ہی محدود رہے۔ کیونکہ وہ محض غزل کے شاعر تھے۔

(باقی)

ہماری مطبوعات

من ویزدان	آٹھ روپیہ
مذہبی استفسارات و جوابات	چھ روپیہ ۷۵ پیسے
جمالستان	چھ روپیہ ۷۵ پیسے
نگارستان	پانچ روپیہ
مکتوبات نیاز (تین حصہ)	پندرہ روپیہ
شہاب کی سرگزشت	دورو پیہ ۵۰ پیسے
تاریخ کے گمشدہ اوراق	دو روپیہ
مزاهب عالم کا تقابلی مطالہ	ایک روپیہ ۷۵ پیسے
محمد قاسم سے حملہ بابر تک	چھ روپیہ ۵۰ پیسے
فراست الید	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
مالہ و ماعلیہ	دو روپیہ ۵۰ پیسے
مجموعہ استفسارات (سوم)	تین روپیہ ۷۵ پیسے
انتقادیات	چار روپیہ ۵۰ پیسے
ایک شاعر کا انجام	ایک روپیہ —
نقاب اٹھ جانے کے بعد	— ۷۵ پیسے
جذبات بھاشا	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
شبنمستان کا قطرہ گوہریں	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
عرض نغمہ	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
اقبال نمبر	تین روپیہ
ہندی شاعری نمبر	چار روپیہ
مصحفی نمبر	تین روپیہ
نظیر نمبر	تین روپیہ
غالب نمبر	پانچ روپیہ

منیجر دفتر نگار پاکستان کراچی ۲۰

NTHLY NIGAR-E-PAKISTAN REGD. No. S. 2472

نگار پاکستان کے خاص نمبر

اقبال نمبر (سالنامہ ۱۹۶۲ء) جسے پاکستان کے معجز بیان شاعر اقبال کے نام نامی پر موسوم کیا گیا ہے
اس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتدا اور مختلف ادوار شاعری، اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف، اس کا آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
قیمت:۔ تین روپے

مصحفی نمبر نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ جس میں اردو ادب کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی "مصحفی" کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، ان کی ابتدائی تعلیم، ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقاء، ان کی تالیف و تصانیف، ان کی غزل گوئی و مثنوی نگاری، ان کے معاصر شعراء و ادباء اور ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر مستقل عالمانہ بحث کی گئی ہے۔
قیمت:۔ تین روپے

نظیر نمبر نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ۔ جس میں نظیر اکبرآبادی کا مسلک، اس کا فارسی و اردو کلام میں عارفانہ رنگ اس کی قدرت بیان و زبان، اس کا معیاری تغزل، ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ، اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صناع و طباع شعراء کا فرق، معاصرین کی رائیں، مستند ادباء کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اسکی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔
قیمت:۔ تین روپے

غالب نمبر سالنامہ ۱۹۶۱ء۔ جس میں مرزا غالب کی فارسی و اردو شاعری کی خصوصیات کو بالکل نئے زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ خاص نمبر اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے طلباء اور شائقین ادب کے لئے بیحد مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

ہندی شاعری نمبر جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔
قیمت:۔ چار روپے

نگار پاکستان کا سالنامہ ۶۳ء

"نیاز نمبر" ہوگا

جس میں تقریباً پاک و ہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اکابر ادب شریک ہو رہے ہیں۔
اس میں حضرت نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو مثلاً
ان کی افسانہ نگاری، تنقید، اسلوب نگارش، انشاپردازی، مکتوب
نگاری، دینی رجحانات، صحافتی زندگی، شاعری، ادارتی زندگی،
ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل
بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا
جائیگا۔ گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت
و فن کا ایک ایسا مرقع ہوگا جو اس
سلسلے میں ایک مستند دستاویز
کی حیثیت رکھیگا اور علم
و ادب کی تاریخ
میں یادرہیگا۔

Title Printed at Fakhri Printing Press Karachi.